علامہ اقبال کے تصور ابلیس کی معنوی جہات

مقالہ برائے

ایم۔فل

مقالہ نگار

ہادی احمد بیگ

نگران

ڈاکٹر راشد عزیز

شعبۂ اُردو
سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر

۲۰۱۸

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

Facebook Group Link :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

فہرست

پیش لفظ

اقبال پر بہت لکھا جا چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ شیکسپیئر کے بعد دنیا کے دوسرے بڑے فنکار ہیں جن کے فکر و نظر پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ایک اندازے کے مطابق پانچ ہزار سے زائد کتابیں و مضامین دنیا کی متعدد زبانوں میں اقبالیات کے حوالے سے موجود ہیں۔اردو ،فارسی وانگریزی زبانیں اس حوالے سے اولیت کی حامل ہیں کیونکہ اقبال کے فکر و نظر اور ان کی تخلیقی کائنات کے فوارے انہیں تین زبانوں میں پھوٹے ہیں۔بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے تو اب لکھنے کی نہ گنجائش ہوگی اور نہ احتیاج۔یہ دوسری بات ہے کہ اقبال پر ہوئے اس تحقیقی وتحلیلی، تجزیاتی و استنباطی،تعبیراتی وتشریحاتی کام میں سے کتنا معیاری ہے اور کتنا غیر معیاری۔ اس کا فیصلہ صرف اور صرف اقبال شناس حضرات ہی کر سکتے ہیں ۔

اقبال کا فکر ونظر آفاقی نوعیت کا ہے۔اس کی معنویت زمان و مکاں کی پہنائیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جس کے سبب یہ فکر و نظر ہر وقت تازہ بہ تازہ اور ہر دم نئے سے نیا معلوم ہوتا ہے۔اقبال شناس اور ماہرین اقبالیات کے ساتھ ساتھ دیگر اہل علم و دل باختگان اقبال اس واقعیت کے پیش نظر اس وقت سے برابر اقبال پر لکھتے آیے ہیں جب سے ان پر لکھنا شروع ہوا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور جاری رہے گا۔

جس طرح شاہین، مرد مومن ،عقل وعشق وغیرہ اقبال کے فکری وفنی نظام کے استعاراتی و علامتی تلازمات ہیں جن سے بنیادی طور پر انکے فلسفہ خودی و بے خودی کی ترجمانی ہوتی ہے بالکل اسی طرح ابلیس کی شخصیت بھی اسی علامتی و استعاراتی نظام کا ایک نمایاں حصہ بن کر اپنے اجابی وسلبی پہلوؤں کے ہمراہ اسی ذیل میں جلوہ گری کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔صبر و صلابت، جہد مسلسل،جستجو و آرزو،سوز وگداز وفراق اور حسن تدبیر ابلیس کی پیچیدہ شخصیت و کردار کے اجابی پہلو

ہیں، جو اقبال کے منظور نظر ہیں کیونکہ ان کے فلسفہ خودی کے یہ اجزائے ترکیبی ہیں ۔نبوت و رسالت جو خودی کے دوسرے رخ یعنی بے خودی کے اساسی ارکان میں سے ہیں ان سے ابلیس کی روگردانی اس کی شخصیت کے سلبی پہلو کو ابھارتا ہے جو اسے دارالوجود میں ایک منفی کردار کے روپ میں ابھار کر منصۂ شہود پہ لاتا ہے۔ان خصوصیات کو مدنظر رکھ کر ابلیس ،اہرمن و یزدان جیسے عناوین پہ کہنے کو اردو میں ''بہت'' کچھ لکھا جا چکا ہے اگر چہ وہ زیادہ تر چھوٹے چھوٹے مضامین یا کچھ تحقیقی مقالات کی صورت میں ہی ہیں اور جہاں تک مبسوط انداز اور نہایت شرح و بسط کی بات ہے تو اس حوالے سے کچھ زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ یہ سبھی کاوشیں جہاں اقبال کے تصور ابلیس کی تفہیم وتشریح کی عکاسی کرتی ہیں وہیں انفرادی سطح پر اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کی بھی غمازی کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔راقم بھی اس حوالے سے اپنے ذوق وشوق اور فکری منہاج کے مطابق اقبال کے تصور ابلیس کے حقائق و دقائق کے پرتو میں سوچنے کا شوق ابتدائی ایام سے اپنے دل و دماغ میں رچائے ہوئے تھا۔خوش قسمتی سے جب سینٹرل یونی ورسٹی کشمیر میں تحقیق کے حوالے سے میرا داخلہ ہوا تو راقم نے ایم فل کے مقالے کے لیے اسی موضوع کا انتخاب کیا۔یہ اس لیے کہ اقبال کی حرکی شخصیت کے ساتھ انکے پیام کی حرکیت کے جو متحرک علامتی و استعاراتی عناصر اپنی معنویت کے پیش نظر موجزن ہیں ان میں ابلیس بھی ایک سر برآوردہ عنصر کے بطور پیش پیش ہے۔اس لیے اس عنصر کی ہمہ جہت معنویت کا سراغ لگانا کافی اہم ہے۔

اگر راقم نے اپنی تہی دامانی اور بے بضاعتی کے عالم میں اس حوالے سے ایک حرف یا ایک لفظ کے برابر ہی کچھ جدت پسندانہ کہا ہو تو میرے لیے فخر کا سامان ہوگا۔نازاں ہستم کہ کاری کردم۔باقی کوئی دعوا نہیں کیونکہ ہم خود ہی جانتے ہیں کہ یہ کاوش ٹوٹے پھوٹے الفاظ کی ایک اپنی سی تحقیقی سعی ہے جسے ہم تحقیق و نقد ونظر کی وادی خارزار میں اپنی اوائل عمری میں انجام دے رہے ہیں۔ جس میں خامیاں و کوتاہیاں حتماً ہوسکتیں ہیں۔مگر یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہیے کہ کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی اگر چہ وہ اپنے آپ میں کامل ہی ہو تو اس حقیقت کے پیش نظر ایک ابتدائی و نو خیز تحقیقی سعی کا کیا حال ہوگا۔امید ہے کہ آئیند ہ ہونے والا کام اس

موضوع یہ وقیع ہونے کے ساتھ بڑا دقیق بھی ہو اور اس کے لیے میری یہ ادنا سی کوشش ایک خاکے اور اشارے کا کام دے۔

میرا یہ مقالہ ''علامہ اقبال کے تصور ابلیس کی معنوی جہات'' کل تین ابواب اور ایک ماحصل پر مشتمل ہے جس کی مختصر سی تفصیل یوں ہے۔

پہلا باب: ''تخلیق ابلیس اور بعد تخلیق اس کی وجہ شیطنت'' کی سرخی کے تحت قلم بند ہوا ہے جس میں مختلف تمدنوں اور ادیان میں تصور ابلیس کے متعلق پائے جانے والے اعتقادات و نظریات کا بیان ہوا ہے اور آخر پر ابلیس کی وجہ شیطنت کے ساتھ اس کے فلسفہ وجود کے حوالے سے بحث ہوئی ہے۔

دوسرا باب: ''ابلیس اور فلسفہ خودی و بے خودی'' ہے جس میں خودی و بے خودی کے فلسفے پر بحث ہوئی ہے اور ابلیس کی شخصیت کا جو تعلق اس فلسفے کے ساتھ ہے اس پر گفتگو ہوئی ہے۔

تیسرا باب: ''علامہ اقبال کے فکر و فن کے لحاظ سے دنیا میں ابلیس کے مختلف مظاہر'' کے عنوان سے ہے جس میں اقبال کے نقطۂ نگاہ سے جو دنیا میں ابلیس کے چیدہ چیدہ اور پیچیدہ متنوع مظاہر ہیں ان پر بحث و گفتگو ہوئی ہے۔

آخر پر ماحصل میں ان خاص نکات کو پیش کیا گیا ہیں جو مطالعے کے دوران سامنے آیے۔

اظہار تشکر

بعد حمد پروردگار میں مجموعی طور پر ان سب افراد کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کام میں میری مدد فرمائی۔ بالخصوص میں شبیر احمد اور امتیاز احمد ڈار صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مواد کی فراہمی کے حوالے سے میری مدد فرمائی۔ اسی صف میں عابد حسین ڈار بھی شامل ہے جو قدم قدم پر پیش خدمت رہے۔ برادر وہم سان ریسرچ اسکالر محمد یونس ٹھوکر صاحب کا انتہائی مشکور ہوں کہ انہوں نے بڑی محنت شاقہ کے ساتھ میری مدد فرمائی۔ سابقہ صدر شعبۂ اردو سینٹرل یونیورسٹی کشمیر جناب پروفیسر نذیر احمد ملک صاحب کے بھی ممنون ہیں کہ ان کے حکیمانہ مشوروں نے اس مقالے کے خاکے کو اپنی آخری شکل میں ڈھالنے کی راہ ہموار کی۔آخر پر میں اپنے استاد، مربی اور نگران جناب ڈاکٹر راشد عزیز صاحب کا انتہائی سپاس گزار ہوں جن کی رہنمائی میں یہ کام سرانجام پایا۔

اللہ سے دست بدعا ہوں کہ وہ ان سب کی توفیقات میں روز بہ روز اضافہ فرمائیں اور انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھیے۔آمین

ہادی احمد بیگ

باب اول

تخلیق ابلیس اور بعد تخلیق اس کی وجہ شیطنت

ہستی کے اسرار و رموز کی بوقلمونی خیرہ کنندہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی دلچسپ بھی ہے۔ اس کی یہ خیرہ کنندگی اور دلچسپی جس جذبے کو بنیادی طور پر ابھارتی ہے۔ وہ اس کے اجزائے ترکیبی کے متعلق دعوت فکر ،بصیرت اندوزی اور ذوق عمل و جستجو سے عبارت ہیں ۔ہستی ایک مثلث پر مشتمل ہے؛ خدا ، انسان اور کائنات ۔خدا کی ذات ساری ہستی کائنات کی روح رواں ہے ، کائنات خدا کی تخلیقی فعلیت کا اظہار اور انسان اس تخلیقی فعلیت و جلوہ آرائی کا گل سر سبد ہے ۔اس گل سر سبد کے رشد ونمو کے لئے خدا نے دنیا کو منتخب کر لیا، جہاں انسان کے اس رشد ونمو کی راہ میں بظاہر بہت سے موانع موجود ہیں اور ابلیس کو ان موانع میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

لفظ ابلیس'' الابِــلاس '' سے مشتق ہے جو افعال کے وزن پر ہے جس کے لغوی معنی سخت ناامیدی کے باعث غمگین ہونے کے ہیں ۔بعض لغویین کا خیال ہے کہ لفظ ابلیس اَبلَس سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ہے کہ وہ مایوس ہونے کی وجہ سے مغموم ہوا ۔[1]

چناں چہ قرآن میں بیان ہوا ہے:

و یوم تقوم الساعة یبلس المجرمون[2]

(اور جس دن قیامت برپا ہوگی گناہ گار مایوس ومغموم ہو جائیں گے۔)

پھر دوسری جگہ بیان ہوا ہے:

اخذنا ھم بغتة فاِذاھم مبلسون[3]

(تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہو کر رہ گئے۔)

تقریباً انہیں معنوں میں ابلیس کا مترادف لفظ شیطان لغات میں آیا ہے ۔ ماہرین لغات لفظ شیطان کو''**شطن**'' سے ماخوذ مانتے ہیں جس کے معنی ''دور ہونا'' کے ہیں اور شیطان ہر بد روح کو کہتے ہیں جو اپنی سرکشی اور نافرمانی سے حق سے دور ہو چکا ہو۔اس دوسری قسم کو شیطان کہتے ہیں، پھر اس لفظ کا اطلاق ہر سرکش اور نافرمان پر بھی ہونے لگا خواہ انسان ہو یا جن یا کوئی

جانور۔مثلاً شیاطین العرب کے معنی ہیں عرب کے سرکش اور نافرمان لوگ اس حوالے سے قرآن میں آیا ہے:

و کذالک جعلنا لکل نبی عدواً شیاطین الا نس والجن [۴]

(ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے شیطان (سیرت)انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔)

ابلیس کی تخلیق کب عمل میں آئی یہ ایک پر اسرار اور محیر العقول امر ہے اور اس حوالے سے بہت سی روایات اور مختلف اقوال پائے جاتے ہیں جو اپنی پر اسراریت اور غیر تاریخیت کی بنا پر ناقابل توثیق ٹھہرتے ہیں ۔ انہیں مختلف روایات اور متنوع اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ ابلیس کی ''پیدائش دنیا کی ابتدا سے ایک لاکھ چوالیس ہزار سال بعدظہور میں آئی ہے'' ۔[۵]

تصور ابلیس و ابلیسیت کے اس ظہور کے حوالے سے مختلف اقوام و مذاہب اور تہذیبوں میں جو گوناگوں افکار و تصورات نظر آتے ہیں اس کا ایک تاریخی جائزہ پیش کیا جارہا ہے ۔مختلف ملل ونحل میں جہاں تک تصور ابلیس کا سوال ہے تو بابلی تہذیب و تمدن (Babalonian civilization) کا تذکرہ اپنی قدامت کے پیش نظراس حوالے سے اولیت کا حامل ٹھہرتا ہے ۔ بابل یعنی موجودہ خطۂ عراق کو ساری دنیا انسانی تہذیب وتمدن کا اولین گہوارہ تسلیم کرتی ہے ۔ جہاں تک بابل کے لوگوں کے مذہبی عقائد کا تعلق ہے تو اس حوالے سے محققین کی آراء اور ماہرین آثارقدیمہ کی کشفیات بڑی چشم کشاء ہیں ، ان تحقیقی آراء وکشفیات کے مطابق بابل کے لوگ متعدد دیوی دیوتاؤں کو اپنی عبادت کا ذریعہ بناتے تھے جنہیں وہ مظاہر فطرت اور قدرت کے مستقل نمونے ونمائندے مان کرتعظیم وتکریم کے ساتھ ساتھ پرستش بھی کیا کرتے تھے۔ان دیوی دیوتاؤں میں چند نمایاں اور بہت ہی اہم دیوی دیوتا عشتار،تموز ،نرجل، اشور، انجیجی، نامتر، تیامت اور سب سے اہم و قدرتمندمردوخ مانے جاتے تھے۔ یہ سبھی دیوتا بابل کے لوگوں کے مطابق خیرو برکت ،آرام وآسائش اور امن امان کے علاوہ بابل کے کلی نظم ونسق کے بنیادی عامل تسلیم کیے جاتے تھے۔ جہاں تک ''شر'' یا تصور ابلیس کا سوال ہے تو اس حوالے سے بابلی کوئی مستقل و مشخص عقیدہ ابتداء میں نہیں رکھتے تھے۔ اوپر جن دیوی دیوتاؤں کا تذکرہ ہوا ان میں

سے تیامت بابلیوں کے نزدیک ایک بڑی اور قدرتمند دیوی مانی جاتی تھی، جو ایک خاص مرحلے پر بدی یعنی شیطانی رخ اختیار کر کے اس ساری کائنات اور بابل کے دوسرے سبھی خداؤں اور دیوی دیوتاؤں کی نابودی کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ جس کے مقابلے کے لئے بابل کے دوسرے طاقت ور دیوتا جیسے انشر اور انُو نکلتے ہیں مگر انہیں کوئی کامیابی نہیں ملتی ۔ آخر پر مردوخ تیامت کے مقابلے کے لئے آتے ہیں مردوخ تیامت کو ایک شدید جنگ کے بعد شکست دے کر دوٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کا خاتمہ کرتا ہے۔ مالک رام اس صورتحال کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> ادھر دیوتاؤں کا سرغنہ انشر تھا اس نے اپنی جماعت کی حمایت کا کام انو کے سپرد کیا۔ لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ تیامت کا جتھا بدستور روز بروز طاقت پکڑتا گیا اور یوں دیوی دویوتاؤں کی ہستی خطرے میں پڑ گئی۔ اس پر انشر نے ایا کو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مقرر کیا۔ لیکن بیسود وہ بھی اس طاقت ور دشمن کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ سب سے آخر انشر نے ایا کے بیٹے مردوخ کو بلایا اور اس سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح دیوتاؤں کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔ اس کے لئے انشر نے دیوتاؤں کا خاص اجلاس بلایا اور ان کے سامنے سپہ سالاری کے فرائض مردوخ کو تفویض کیے۔ چناں چہ ہر طرح کے ہتھیار سج کر مردوخ اس مہم پر روانہ ہوا۔ اس نے تیامت کے لشکر کو شکست دی۔ خود تیامت کو قتل کر دیا اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لایا۔ پھر اس نے تیامت کے جسم کو چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔[۶]

بابل کے لوگ اس واقع کے بعد تیامت کو ایک ابلیسی وشیطانی قوت کے طور پر تسلیم کرنے لگے جو ہر طرح کی بدی ،شر و فساد کا مرکز و محور قرار پائی۔ یوں بابلی دیومالا(Mythology) کی رو سے تیامت ابلیس اور بدی وشرور کے ایک برجستہ نمونے کی حیثیت سے متعارف ہوتی ہے۔

دنیا کی ایک اور قدیم و متمدن قوم یعنی مصری قوم(Egyptian) بھی بدی کے تصور یا عقیدے کے متعلق ایک خاص نوعیت کے اعتقاد کی حامل رہی ہے ۔ قدیم مصری بھی بابلیوں کی طرح متعدد خداؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں نمایا ں ترین آمون(Amon) آتون(Aton) را(Ra) اوزیرس(Osiris)ہور(Hor) تھوتھ(Thoth) سِب (Seb) اور سیت(Set) یا سیتھ(Seth) وغیرہ تھے۔ ان میں آمون قدیم مصری تہذیب کے ایک خاص عہد میں خداؤں کا خدا مانا جاتا تھا۔ جو ہر طرح کی خیرو برکت کا ضامن مانا جاتا تھا ، جس نے قبطیوں کے بقول قدیم مصری تہذیب کو (Egyptian Civilization) ساری دنیا میں شکوہ و عظمت بخشی تھی۔اوزیرس کو مصری نیکی و زرخیزی کا خد امانتے تھے جو شیطان صفت سیتھ کے ہاتھوں ماراجاتا ہے:

> Osiris is conceived as a real person who as the representative of moralgoodness, succumbs in his struggle with evil and dies.[۷]

سیتھ جسے قدیم یونانی تیفون(Typhon) کے نام سے پکارتے تھے نہایت طاقتور دیوتا مانا جاتا تھا۔قدیم مصری دیو مالا کی رو سے سیتھ مظہرِ شیطان تھا جو بدی کی بنیادی علامت بن گیا۔ یہاں اس دلچسپ نکتے کی جانب توجہ مبذول ہوتی ہے کہ لفظ'' سیتھ'' اور عبرانی لفظ'' شیطان''میں ایک صوتی ہم آہنگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ لفظ شیطان شاید اسی سیتھ سے ہی ماخوذ ہے۔ بہرحال سیتھ تمام مصریوں کے نزدیک محض ایک شیطانی دیوتا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی باضابطہ طور پر پرستش بھی کی جاتی تھی:

> Set was not always nor to all Egyptians alike a Satanic deity. He was officially worshipped in an unimportant province of the Nile.[۸]

پہلے پہل سیتھ مصریوں کے نزدیک ایک نہایت توانا دیوتا تھا جس سے وہ بہت ڈرتے تھے مگر وہ ابتدا میں سیتھ کو بحیثیت ایک شیطان کے نہیں مانتے تھے۔ اوزیرس جب مصریوں کے مذہبی و اعتقادی نظام میں ایک نمایاں جگہ پا کر پوجا جانے لگا تب سیتھ ایک شیطانی دیوتا کے

روپ میں مصریوں کے سامنے متعارف ہوتا ہے:

Set the great and strong God of prehistoric times was converted into satan with the rise of the worship of Osiris, set was strong enough to slay Osiris.[9]

مصریوں کی طرح قدیم یونان و روم کے لوگ بھی متعدد دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ان دیوتاؤں میں معروف ترین زیوس(Zeus) ہیدس(Hades) پوزیدون (Poseidon) ہرمیس(Hermes)اور اپالون (Appollon) وغیرہ تھے۔ ان سب دیوتاؤں میں سے یونانی زیوس کو سب سے بڑا یعنی خداؤں کا خداتسلیم کرتے تھے۔ جہاں تک تصورِ شیطان یا بدی کے تصور کا تعلق ہے یونانی اساطیر اور اعتقادات میں شیطان کا کوئی مشخص شخصی تصور نظر نہیں آتا ہے بلکہ مذکورہ بالا دیوتاؤں میں کچھ کو نیکی و خیر کا سرچشمہ مانا جاتا تھا اور کچھ کو عیاری و مکاری اور فتنہ فساد کا غرض ان کو ہر طرح کی شیطنت کا بنیادی محرک تسلیم کیا جاتا تھا۔ابرارحسن اس بات کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں:

The Gods made the human beings fight among themselves and supported their own favourits, wether right or wrong. their own petty jealousies made the humans suffer.[10]

یونانی و رومی اپنے دیوتاؤں کو شیطنت اور نیکی کے بنیادی محرک مان کر ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے شر پسند موجودات کی موجودگی پر اعتقاد و اذعان رکھتے تھے جنہیں وہ ابلیسی و شیطانی موجودات کے حوالے سے جانتے تھے۔ ان میں ہارپیز (Harpies) کو اولیت کا درجہ حاصل ہے جسے انسانوں کا بڑا دشمن تصور کیا جاتا تھا ۔ ان کے وحشیانہ اور بہیمانہ افعال کا ذکر ہمیں مختلف تواریخی اسناد میں اس طرح نظر آتا ہے:

More clearly malicious were the Harpies revolting monsters with bird bodies and the heads of women, who darted down to snatch away or defile food and to carry away persons and destroy them.[11]

دنیا کی معروف تہذیبوں جیسے بابلی ،مصری اور یونانی و رومی تہذیبوں میں ابلیس یا شیطان کے متعلق جو تصورات پائے جاتے ہیں ان کا مختصراً جائزہ لینے کے بعد اب دنیا کے چند بڑے او رعظیم مذاہب ؛ ہندومت، مجوسیت یا زرتشتیت ، یہودیت،عیسائیت اور اسلام میں جو ابلیس کے متعلق افکار ونظریات ملتے ہیں ان پر ایک بالاستیعاب نگاہ ڈالتے ہیں۔

ہندو مذہب دنیا کے قدیم مذاہب میں سے ایک ہے، اس کی موجودہ فکری و اعتقادی ہیئت ترکیبی ہندوستان میں وسطی ایشیا ء اور ایران سے آریاؤں کے داخلے کے بعد وجود میں آ گئی۔وید جو ہندوؤں کے بنیادی مذہبی صحائف کی حیثیت رکھتے ہیں کی تعلیمات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ آریا ءتوحیدی فکر و خیال کے ساتھ انتہائی قرب رکھتے تھے۔مگر ہندوستان کے قدیم آدی واسی باشندوں (دراوڑ) سے گھلنے ملنے اور اختلاط کے بعد انھوں نے ان کے زیر اثر کچھ مصلحتوں کی بنا پر ان کے بہت سے عقائد اور رسومات کو اپنا لیا۔ بت پرستی اور مختلف دیوی دیوتاؤں کی پرستش کا عقیدہ آریاؤں نے زیادہ تر آدی واسیوں سے ہی مستعار لے لیا جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ ہندومت میں کثیر تعداد میں دیوی دیوتا معرضِ وجود میں آگیے ۔وید ، پران، اپنشد ، مہابھارت اور رامائن و گیتا ہندو مذہب کی مقدس کتابیں ہیں جن پر اس دیو مالائی مذہب کی اساس ہے۔ ان مذہبی نوشتوں کی رو سے ہندو مذہب کے سیکڑوں دیوتاؤں میں سے بنیادی طور پر تین نمایاں ترین دیوتا برہما،ویشنو اور شیوا ہیں جن کے ماتحت اور بھی دیو و دیویاں ہیں۔ برہماہندوؤں کے بقول عالم ہستی کا خالق اور قائم بالذات ہے ۔ویشنو عالم ہستی کی بقاء اور حفاظت و انصرام کا ذمے دار اور شیواتعمیر وتخریب کا ایک زبردست حاکم مانا جاتا ہے۔بقول محمد مظہر الدین صدیقی :

> شیوا ایک دوسرے اصول کا نمائندہ اور ویشنو کی عین ضد ہے ۔ وہ زندگی کی پرانی شکلوں کو مٹاتا اور نئ صورتیں پیدا کرتا ہے۔وہ تعمیر وتخریب کی تمام قوتوں کا مالک اور فطرت کی ساری کارروائیوں کا نگرانِ کار ہے ۔ وہ ہزاروں انسانوں کو امراض ، وباؤں ، زلزلوں اور طغیانیوں کے ذریعے موت

کے گھاٹ اتارتا اور ان کی جگہ لاکھوں نئے انسان پیدا کرتا ہے۔[۱۲]

ہندوؤں کے مذکورہ بالا دیوتا جس طرح خیر و نیکی کی صفات سے آراستہ ہیں اسی طرح شر و بدی کے عاملین میں بھی ان کا شمار ہوتا ہیں ۔مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح ہندووں کے اعتقادی نظام میں شیطان کے متعلق ایسا کوئی واضح ومشخص عقیدہ وتصور نظر نہیں آتا ہے جس کے مطابق شیطان کو مجموعی طور پر شیطنت اور شر و فساد کا محور و مرکز ٹھہرایا جاسکے بلکہ اس کے برعکس یہ برہمنوں کے خدا ہی کبھی کبھی شیطانی رخ اختیار کرتے ہیں اور یوں شیطانی اعمال و افعال ان سے سرزد ہوتے ہیں ۔پال کیرس اس واقعیت کے متعلق کہتے ہیں:

The Brahman Gods in their turn are by no means the representatives of pure goodness. Not only do they frequently assume shapes that to the taste of any western nation would be exceedingly ugly and diabolical, but the same deities who in one aspect are beneficent powers of life, are in another respect demons of destruction.[۱۳]

اس ساری صورتحال کے باوجود ہندو مذہب میں کچھ ایسی نظیریں ملتی ہیں جو ہندووں کے نزدیک شیطان کے مظاہر ہیں ان مظاہر میں راوَن اور اندھک آسر نمایاں ترین ہیں ۔ راون ہندووں کی مقدس دیومالائی کتاب ''رامائن'' کے اصلی کرداروں میں سے ایک ہے جو رام کی بیوی ''سیتا'' کو اغوا کرکے ''سیلون'' یا موجودہ سری لنکا لے جاتا ہے ۔آخر کار رام کی بیوی سیتا کو رام کی بڑی جانفشانیوں کے بعد اسے راون کے چنگل سے نجات ملتی ہے۔ ہندو رام کو ویشنو کا ساتواں اوتار مانتے ہیں اور راون کو مظہر ابلیس قرار دیتے ہیں ۔راون فتنہ وفساد پھیلانے والے ایک گروہ کے سردار تھے جو راکھشس کہلاتے تھے۔ راون زبردست قوت و طاقت کا مالک تھا یہ قوت و طاقت اس نے برہما کی کی عبادت اور بڑی تپسیاؤں کے بعد حاصل کی تھی مگر رام سے نبرد آزما ہوکر وہ شیطنت کا ایک کامل مظہر بن جاتا ہے۔ رامائن میں راون کی قوت اور شخصی تنزل کے بارے میں یوں بیان ہوا ہے:

راون در اثـر عبـادت و ایمان به برهما چنان نیروئی بدست آورد که در قبال ایـزدان ودیـوان هـم شـکسـت نـاپـذیـرشد او می توانست به هر شکلی که بخواهد در آید ،راون خیلی شریرو بدی مجسم بود... ۔[۱۴]

(ترجمہ: راون برہما پر ایمان رکھنے اور عبادت کرنے کی وجہ سے اتنا طاقت ور بنا کہ وہ دیوتاؤں کے مقابلے میں شکست ناپذیر بن گیا۔وہ کوئی بھی روپ دھار سکتا تھااور وہ بہت ہی شریر وشیطنت کا مجسم پیکر تھا۔)

جہاں تک اندھک آسر کا سوال ہے تو وہ ہندی دیومالا کی رو سے دجال کے مترادف معلوم ہوتا ہے جو آخر زمانے میں دنیا میں ظاہر ہو کے بڑے پیمانے پر فتنہ وفساد اور تباہی و بربادی پھیلائے گا:

اندھک آسر یعنی بعد میں آنے والا ، آسر یعنی بعد میں آنے والا اور اندھک یعنی اندھے کی طرح۔[۱۵]

دجال صفت اس اندھک آسر کی غیر معمولی توانائیوں اور قوتِ تصرف وتسخیر کا حال ہری ونش پران میں یوں بیان ہوا ہے:

اس کے ایک ہزار ہاتھ (یعنی ہر طاقت پر قادر) ہزار سر(یعنی بہت سوجھ بوجھ رکھنے والا) اور دو ہزار پاؤں(یعنی زمین کے ہر حصے میں با آسانی پہنچ جانے والا) اور دو ہزار آنکھوں (یعنی انتہائی بصیرت والا) ہوتے ہوئے بھی وہی شیطان اپنی انا اور خود سری کی وجہ سے اندھے کی طرح چلتا تھا اسی لیے وہ ''اندھے جیسا'' نام سے مشہور ہوا۔[۱۶]

ہندی آریاوں کے تصور ابلیس کے بعد ان کے پیش روؤں یعنی ایرانی آریاؤں کے تصورِ ابلیس کا جائزہ کچھ یوں ہے ۔ ایرانی آریا قدیم زمانے سے ہی اپنے توحیدی افکار و اعتقادات کی بنا پر دنیا کی ساری تہذیبی وتمدنی تاریخ میں ایک منفرد مقام و مرتبے کے حامل رہے ہیں انہوں نے اپنی چند ہزار سالہ تہذیبی و اعتقادی تاریخ کے کسی بھی مرحلے پر بت پرستی اختیار نہیں کی ۔مگر زرتشتیت کو چھوڑ کر باقی تمام قدیم ایرانی مذاہب جیسے مجوسیت،مانیت و مزدکیت ثنویت

اور ثنوی افکار و عقائد کے پرستار رہے ہیں۔ثنویت کے زیر اثر قدیم ایرانی اقوام اس عالم ہستی کو دو خداؤں یعنی آہورامزدا یا یزدان اور انگرامینویا اہرمن کی تخلیق مانتے تھے۔آہو رامزدا جسے وہ یزدان کے نام سے بھی پکارتے تھے ان کے نزدیک خدائے خیر و نیکی تھااور انگرامینو یا اہرمن خدائے شر و بدی تسلیم کیا جاتا تھا۔ایرانی یزدان یعنی آہورا مزدا کو نور کا خالق و سرچشمہ مانتے تھے اور اسی طرح اہرمن کو ظلمت کا خالق اور منبع گردانتے تھے۔مجوسیوں کے بقول اس عالم ہستی میں جو خیر و نیکی اور صلح و صفا پائی جاتی ہے وہ آہو رامزدا کی قدرت کاملہ کا نتیجہ ہے اور جو شر و بدی کے مظاہر اس کائنات میں پائے جاتے ہیں وہ اہرمن کی بدولت ہیں لہٰذا یہی اہرمن اصل میں شیطان ہے۔مجوسیت کے برعکس زرتشتی مذہب کی تعلیمات توحیدی تعلیمات سے ہم آہنگ اور دوئیت سے پاک تھیں۔زرتشت ہستی کو ایک خدائے واحد کی خلقت مانتے تھے اور وہ عالم ہستی میں خدائے واحد کی ذات کے علاوہ کسی دوسری ازلی قوت کے وجود کے معتقد نہیں تھے۔زرتشت نے ثنویت کے خلاف بڑی جدوجہد کر کے ایرانی اقوام کو دوئی پرستی (Dualism) سے نجات دینے کی بھرپور کوشش کی ۔اقبال زرتشت کی اس انقلابی جدو جہد کے متعلق کہتے ہیں:

> جدید مستشرقین کی تحقیقات دھندلی روشنی میں قدیم ایرانی ہم کو دو گروہ میں منقسم نظر آتے ہیں ۔ایک قوت خیر کا حامی ہے دوسرا قوت شر کا اس وقت یہ حکیم اعظم (زرتشت) ان کی اس شدید پیکار میں شریک ہوتا ہے اور اپنی اخلاقی قوت سے شیاطین کی پرستش اور مجوسی پیشواؤں کے ناقابل برداشت مذہبی رسوم کو ہمیشہ کے لیے مٹادیتا ہے۔ [12]

مگر افسوس کہ زرتشت کے بعد اُس کی الوہی تعلیمات دھیرے دھیرے مسخ ہوکراور مجوسی، مانوی و مزدکی علماء و مفکرین کے ہاتھوں بھینٹ چڑھ کرثنوی رنگ اختیار کرگئیں۔زرتشت کی تعلیمات کو مسخ کرنے کے لیے مجوسی علماء نے اس زمانے کے پورے ایران میں بڑی شدو مد کے ساتھ ان تعلیمات کے خلاف تبلیغ کی۔جس کے نتیجے میں سارے ایرانی ثنویت کی زد میں آگیے، یوں وہ زرتشت کے تصورِ شر کے متعلق الوہی تعلیمات سے محروم ہوکر نظریہ شر کے حوالے سے

ایک اعتقادی بحران کے شکار ہوگیے:

زرتشت کے نظریہ شر میں انھوں نے اتنا مبالغہ کیا کہ زرتشتی کائنات دو مستقل حصوں میں تقسیم ہوگئی،جن میں سے ایک کا حکمران آہورامزدا (خالق خیر) اور دوسرے انگرامینو(خالق شر)۔آہورامزدا کی ہر مخلوق اور ہر فرشتے کے بالمقابل انھوں نے ایک شیطانی مخلوق پیدا کردی۔[۱۸]

نظریہ شر کے متعلق مجوسیوں کی مبالغہ آرائی کے نتیجے میں رفتہ رفتہ زرتشتی مذہب کی مقدس کتابیں اوستا، گاتھا،اور ژند وغیرہ تحریف کا شکار ہوکر نظریہ شر کے متعلق اپنی حقیقی تعلیمات سے ہاتھ دھو بیٹھیں جس کے سبب دین زرتشت مخمصہ انگیز ثنوی تعلیمات کے ایک پیچیدہ طومار میں تبدیل ہوا۔ صدیوں پر مشتمل نظریہ شر کے متعلق اس اعتقادی خلفشار اور خلجان نے قدیم ایرانی اقوام کو بالآخر ثنویت یا صحیح لفظوں میں دوگانہ پرستی کا گرویدہ بنا دیا۔یہ دوگانہ پرستی خدائے خیر یزدان اور خدائے شر اہرمن کی عظمت و تقدیس پر استوار تھی خدائے شر کو مجوسی ابلیس اور خدا کا ازلی حریف مانتے تھے۔شہید مطہری اس دوگانہ پرستی کے متعلق کہتے ہیں:

اعتقاد به مبدا شر و عامل تبهکاری و خطا در طول زمان تحولی حاصل کرده و رفته رفته دین زرتشت را به صورت یك آئین دو گانه پرستی (دوآلیزم) اخلاقی در آورد ،در طی زمان(انگرامینو) ابلیسی نیرو مند گردیده است که در برابر اهورامزدا مقاومت کرده و آن هردو به صورت دو عامل متساوی با یکدیگر به ستیز و نبرد پرداختند۔ در قطعات و اجزای اوستا که از آثارقرون اخیر است (انگرامینو) را همشان و همطراز خدای اهورامزدا می شناسد ۔[۱۹]

(ترجمہ: شر کے مبدا اور تباہکاری و بربادی کے عامل پر اعتقاد امتداد زمانہ کی بدولت متغیر ہوا، دھیرے دھیرے زرتشت کا دین دوگانہ پرستی کی شکل اختیار کرگیا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگرامینو ایک طاقتور ابلیس بن کر آہورامزدا کے مقابلے میں مزاحمت کرکے ایک ہم

شان حریف کی صورت میں اس کے خلاف جنگ و جدل کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اوستاجو
مجوسی دور کی آخری صدی کی مذہبی کتابوں میں سے ایک ہے اس میں انگرامینو کو آہورامزدا کا
ہم پلہ و ہم شان قرار دیا گیا ہے۔)

ابراہیمی ادیان میں سب سے قدیمی مذہب یہودیت ہے جو اپنے توحیدی طرز فکر اور دیگر مخصوص مذہبی اعمال و مراسم کی بدولت اپنے وقت کے دوسرے مذاہب اور مکاتب فکر میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ یہودیت کی چند ہزار سالہ مذہبی تاریخ میں کئی ایسی قومیں اور مذاہب نظر آتے ہیں جن سے یہودیت کا راست طور پر تامل یا تصادم رہا ہے۔ جن اقوام یامذاہب کے ساتھ یہودیت کا گوناگوں وجوہات کی بنا پر تصادم رہا ہے اور جن کے تہاجمی افکار اور ثقافتی اثرات نے یہودیت کی تاریخی نشو ونما میں کسی حد تک ایک رول ادا کیا ہے ان میں قبطی، موآبی،آرامی ،عمونی ،فلسطی اور مجوسی نمایاں نظر آتے ہیں ۔ اگر چہ یہودی اس بات کے مدعی ہیں کہ یہودیت تورات ،تلمود اور مجموعی طور پر موسوئ افکار وتعلیمات پر مبنی ہیں مگر تاریخی شواہد اس کے برعکس گواہی دیتے ہیں ۔ مذکورہ بالا اقوام و مذاہب کے تہاجمی افکار ونظریات سے یہودیوں کا جوعقیدہ خاص طور پر متاثر ہوا ہے وہ شر کے متعلق ان کا عقیدہ ہے اور جس قوم و مذہب سے اس حوالے سے وہ خصوصاً متاثر رہے ہیں وہ مجوسی ہیں ۔ ۵۸٦ ق م میں بابل کے بادشاہ نیبوکدنضر (بخت نصر) نے یروشلم پر دھاوا بول کر ہیکل سلیمانی کو ویران کر کے ہزاروں یہودیوں کو تہہ تیغ کیا اور ہزاروں دیگر کو اپنے ساتھ اسیر کر کے بابل لایا۔یہودیوں کی بابل کی اس اسارت کے دوران ہی ۵۳۹ ق م میں ایران کی ہخامنشی سلطنت کے فرمانروا کوروشِ کبیر بابل کی سلطنت کا خاتمہ کرکے وہ یہودیوں کو اسارت کی زندگی سے نجات دلا کر بڑے عزت و احترام کے ساتھ یروشلم واپس بھیجتا ہے ۔محققین اور مورخین کے بقول اس واقعے کے بعد یہودیوں کا شر کے متعلق جوعقیدہ وتصور تھا کافی متاثر ہوا،چناں چہ مجوسیوں سے اجتماعی سطح پر بابل میں اختلاط و آمیزش کے بعد یہودیوں کا عقیدہ شر یا تصور ابلیس مجوسیوں کی طرح ایک ثنوی رنگ اختیار کرتا ہے بقول مظہر الدین صدیقی:

یہودی اور زرتشتی مذاہب میں بعض ایسی مماثلتیں پائی جاتی ہیں جن سے یہ

> خیال ہوسکتا ہے کہ یہودیوں نے اپنے بعض عقائد ایرانیوں سے مستعار لیے ہیں ، مثلاً نظریہ شر کو لیجیے بابل کی جلاوطنی کے بعد کی یہودیت میں یہ نظریہ جلاوطنی سے قبل کے نظریہ سے مختلف ہے۔تورات کی آخری کتابوں میں شیطان کو وہی درجہ حاصل ہے جو اوستا کی آخری کتابوں (مجوسی اوستا) میں انگرامینو کو ۔زرتشت کی تعلیم میں خدا نور اور ظلمت دونوں کا خالق ہے۔زمانہ مابعد میں یہودیوں کے یہاں شر اور بالخصوص طبعی جسمانی مصائب کا بانی مبانی شیطان ہے۔[۲۰]

بابل کی اسارت اور جلا وطنی سے قبل یہودی شیطان کے متعلق ایک خاص نوعیت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ وہ شیطان کو عزازیل کے نام سے پکارتے تھے اور اسے خدا کا ایک خلق کردہ فرشتہ مانتے تھے جو کسی مستقل تخلیقی قوت کا حامل نہیں تھا۔ بلکہ خدا کے فرشتوں میں سے ایک متمرد فرشتہ تھا جو تمرد وعصیان کی علامت کے طور پر یہودیوں کے درمیان متعارف تھا، جس کے شر سے بچنے کے لیے یہودی خدا کے حضور میں قربانیاں پیش کرتے تھے۔ بابل کی اسیری کے دوران قدیم مجوسی ثنوی افکار سے روبرو ہونے کے بعد یہودی اعتقادات میں شیطان ایک مستقل تخلیقی قوت اور عزم و ارادے کی حامل شخصیت کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے جو خدا کی ذات کے مدمقابل ہر حوالے سے ایک مقتدر حریف کے طور پر ٹھہرتا ہے۔دراصل یہودی فکر و اذہان میں شیطان یا کلی طور پر شر کا مسئلہ ابتدا ہی سے تشویش کا باعث بنا ہوا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ہی خدا خالق خیر و نیکی بھی ہو اور اسی طرح خالق شر و بدی بھی،جبکہ اس کی ذات سراسر خیر و نیکی کی حامل ہے۔ مسئلہ شر اور تصورابلیس کے متعلق اسی فکری و اعتقادی بحران کی بناپر یہودی متکلمین کو مجوسی ثنویت بڑی معقول اور منطقی نظر آئی جس کی رو سے اس کائنات کے دو خالق ہیں جن میں ایک خیر و نیکی کا خالق ہے اور دوسرا بدی و شر کا اور یہی دراصل شیطان ہے ۔پال کیرس کا اس حوالے سے نقطۂ نظر یوں ہے:

> The conception of Satan grew more mythological and at the same

time more dualistic.He developed into an independent demon of Evil, and now perhaps under the influence of persian views, the adversary of man became the adversary of God himself. In the story of tobit(150BC) an evil spirit called asmodi plays an important part. His name which in its orignal form is aeshma Daeva indicates a persian origin.He tries to prevent Sarahs marriage because he is in love with her himself, in the Talmud asmodi develops into the demon of lust.[۲۱]

تصور ابلیس کے حوالے سے یہودیوں میں سرایت شدہ ان ایرانی ثنوی افکار کی تنقیح کی خاطر یہودیوں کے دورِ اخیر کے پیغمبروں نے بڑی کوششیں انجام دیں۔اگرچہ وہ اس امر میں پوری طرح کامیاب نہ ہوئے مگر پھر بھی وہ کسی حد تک ان ثنوی آلائشوں کا ازالہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔تورات کی رو سے عزازیل(شیطان)ایک متمرد فرشتہ ہوتا ہے جو خدا کی بارگاہ سے راندہ شدہ ہوکر یہودیوں کو ہر طرح کی برائی اور مکر وفریب کی جانب راغب کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں سے کام لینے میں کوئی تامل نہیں کرتا تھامگر ایک طاقتور اور صاحب ارادہ ہونے کے باوجود تورات کی رو سے عزازیل ثنوی افکار وعقائد کی طرح کسی مستقل وازلی تخلیقی قوت کی حیثیت سے یہودیوں کی متاخر مذہبی تاریخ میں دکھائی نہیں دیتاہے۔تورات (عہد نامہ قدیم) کی کتاب ’’ایوبؑ‘‘ میں حضرت ایوبؑ کے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے جو اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے:

> تب خداوند نے شیطان سے کہا کیا تو نے میرے خادم ایوبؑ کے حال پر غور کیاہے؟ زمین پر اس کی طرح کامل اور راست باز شخص کوئی نہیں جو خدا سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا ہو شیطان نے جواب دیا کیا ایوبؑ بلا وجہ خدا سے ڈرتا ہے؟ کیا تو نے اس کے،اس کے کنبے کے اور اس کی ہر چیز کے اردگرد باڑ نہیں رکھی ہے؟ تو نے اس کے ہاتھوں کے کام میں اسے برکت بخشی ہے جس کے باعث اس کے گلّے بڑھ کر سارے ملک میں پھیل

گیے ہیں ۔لیکن ذرا اپنا ہاتھ بڑھا اور اس کا سب کچھ برباد کر دے تو وہ یقناً تیرے منہ پر تیری تکفیر کرے گا۔خدا وند نے شیطان سے کہا اچھا اس کی ہر شے پر تجھے اختیار دیا جاتا ہے لیکن اسے ہاتھ مت لگانا۔[۲۲]

اس اقتباس سے جو اہم باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ شیطان تورات کی رو سے کسی قدرت مطلق کا مالک نہیں ہے اور شیطان بحیثیت مجموعی ایک ایسا موجود ہے جسے خدا نے انسان کی آزمائش کے لیے خلق فرمایا ہے۔

جہاں تک عیسائیت کے تصور ابلیس کا تعلق ہے تو وہ یہودی تصور ابلیس ہی کی طرح ہے۔کیونکہ عیسائیت میں یہودیت کا وہ ارتقا یافتہ اور تنقیح شدہ تصور ابلیس سرایت کر گیا جس کے آثار یہودیوں کے اخیر زمانے کی مذہبی تصانیف میں ملتے ہیں ۔عیسائیت کی رو سے شیطان ایک شریر اور نافرمان فرشتہ ہے جو بدی اور اخلاقی و اعتقادی انحراف پہ انسانوں کوا کساتا ہے، یہ دراصل شیطان کے متعلق وہ یہودی اعتقادات ونظریات ہیں جن کا اعادہ عیسائی تعلیمات اور افکار کی صورت میں ہوا ہے ۔ان تعلیمات کا بنیادی طور پر جو مطمح نظر ہے وہ یہ ہے کہ شیطان ایک سرکش مخلوق ہے جو انسانوں کے لیے ایک آزمائش کا ذریعہ ہے ۔چناں چہ انجیل برنا باس میں آیا ہے کہ شیطان نے مسیحؑ کو ہر ممکنہ طریقے سے آزمائش میں ڈالا،جس کا واضح ثبوت انجیل مقدس کا یہ اقتباس ہے:

اور چالیس دن اور رات برابر روزہ رکھا اس عرصہ میں رات کو یا دن کو کچھ بھی نہ کھایا برابر پروردگار کے جناب میں اپنی اس قوم کے چھٹکارے کے لیے جس کی طرف اللہ نے اسے بھیجا تھا عاجزی کرتا رہا پھر جب کہ چالیس دن گزر گیے وہ بھوکا ہوا اس وقت اس کو شیطان نظر آیا اور شیطان نے یسوعؑ کو بہت سی باتوں سے آزمایا۔لیکن یسوعؑ نے شیطان کو اللہ کے کلموں کی قوت سے دور ہنکایا۔[۲۳]

شیطان اور شیطنت کا جو تصور عیسائی مذہب میں موجود ہے وہ اس تصور سے کچھ زیادہ

مختلف نہیں ہے جو یہودیت میں پایا جاتا ہے۔اجمالی طور پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عیسائیت میں جو تصور ابلیس پایا جاتا ہے وہ یہودی تصور ابلیس کا نقش ثانی ہے۔

اسلام کا تصور ابلیس تمام ملل و مذاہب کی بہ نسبت سب سے زیادہ منظّم، صحیح و واضح اور عقلی اعتبار سے بڑا ہی کامل ہے ۔کیونکہ اسلامی تعلیمات میں ابلیس کے تشخص کی صاف و شفاف شخصی شناخت ملتی ہے۔ ابلیس فرشتوں میں سے ہے یا کوئی اور مخلوق، ابلیس کی ماہیت کیا ہے، کس چیز یا شے سے ابلیس کی تخلیق عمل میں آئی ہے، ابلیس کی وجہ شیطنت کیا ہے اور سب سے اہم یہ کہ ابلیس کی تخلیق کا فلسفہ کیا ہے؟ ان دلچسپ اور پیچیدہ سوالات کا جواب اسلام نے بڑے مدلل انداز سے پیش کیا ہے ۔جہاں تک ابلیس کے فرشتوں میں سے ہونے کا مسئلہ ہے تو اسلام کا نظریہ اس حوالے سے واضح ہے کہ وہ فرشتوں میں سے نہیں تھا بلکہ جنات میں سے ہے۔جن خدا کی ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنی ماہیت کی بنا پر انسانی نظروں سے اوجھل رہتی ہے ۔لغات میں لفظ ''جن'' کے معنی کچھ یوں آئے ہیں :

الجن خلاف الانس والواحد جنی یقال :سمیت بذالك لانها تتقی ولا تری۔[۲۴]

(ترجمہ: جن برخلاف انسان ہے اس کا واحد جنی ہے، اسے اس لیے جن کہا جاتا ہے کہ یہ پوشیدہ ہے اور دکھائی نہیں دیتا ہے۔)

صاحب لسان العرب اس حوالے سے کہتے ہیں :

الجن نوع من العالم سموا بذالك لاجتنانهم عن الابصار ولانهم استجنوا من الناس فلا یرون۔[۲۵]

(ترجمہ: جن عالم ہستی کا ایک حصہ ہے ان لوگوں کو اس لیے جن کہا جاتا ہے کہ یہ دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے دوسرے یہ کہ یہ خود کو انسان سے چھپاتے ہیں لہٰذا دکھائی نہیں دیتے ہیں۔)

ابلیس کے جنوں میں سے ہونے کا ثبوت قرآن مجید میں بھی واضح طور پر ملتا ہے۔جب خدا فرشتوں اور ابلیس کو حکم دیتا ہے کہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوجاو تو حکم کی تعمیل میں فرشتے

سجدہ ریز ہوجاتے ہیں مگر ابلیس سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے ۔اس موقعے پر خدائے برتر نے ابلیس کے جنوں میں سے ہونے کا اظہار یوں فرمایا ہے:

و اذ قلنا للملائکة اسجدو لآدم فسجدو الا ابلیس کان من الجن... الخ [۲۶]

(ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، بیشک ابلیس جنات میں سے تھا۔)

جنات کی ماہیت انسان سے بالکل مختلف ہے ۔جنات انسانوں کی طرح مٹی اور پانی سے خلق نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں :

وخلق الجآن من مارج من نار ۔ [۲۷]

(ترجمہ: اور جنوں کو آگ کے ملے جلے (مخلوط) متحرک شعلے سے پیدا کیا۔)

یوں یہ واقعیت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جنات کو خدا نے آگ کے شعلوں سے پیدا کیا ہے۔ مزید برآں جب ابلیس آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے تو اس وقت خدا اس سے دریافت کرتا ہے کہ کیا سبب ہے کہ تم نے میرے حکم کے باوجود آدمؑ کو سجدہ نہ کیا۔ ابلیس جواب میں آدم پر اپنی فضیلت جتاتا ہے اور اپنی فضیلت کا باعث ہی یہ قرار دیتا ہے کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدمؑ کو مٹی سے۔اس طرح ابلیس خود اپنی زبانی اپنی ماہیت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ میں آگ سے خلق کیا گیا ہوں۔قرآن حکیم اس بات کی تصدیق ان الفاظ کے ذریعے کرتا ہے:

قال مامنعک اَلا تسجد اذاامرتک قال انا خیر منه خلقتنی من نار وخلقته من طین۔ [۲۸]

(ترجمہ: خدا نے ابلیس سے فرمایا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جبکہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ابلیس نے کہا کہ میں اس سے افضل ہوں ، کیوں کہ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ااور اسے خاک سے۔)

ابلیس ایک ناری مخلوق ہو کے کس طرح فرشتوں جیسی نوری مخلوق کی صفوں میں شامل ہوا

یہ ایک سوال بر انگیز مسئلہ ہے ۔ابلیس کب اور کیسے یہ عروج حاصل کرتا ہے کہ استاد ملائکہ بن جاتا ہے۔ اس کے متعلق روایات کے ایسے نمونے موجود ہیں جو اس بات کا پتا دیتے ہیں کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ابلیس نے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور بالخصوص خدا کے حضور اپنی طول طویل عبادتوں کے طفیل یہ مقام و منزلت کسب کی۔اس طویل زمانے کا تصور ہمارے محدود نوعیت کے اعداد و شمار کے پیمانوں سے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس دنیا کا تصورِ زمان و مکاں اس بے انتہا زمان و مکاں کا احصاء و احاطہ کر سکتا ہے جس میں ابلیس نے صعود و ارتقا حاصل کر کے ملائکہ کی صفوں میں شامل ہوکر بارگاہ خداوندی میں باریاب ہونے کا شرف حاصل کیا تھا۔ابلیس کی اس حیرت افزا عبادت و ریاضت اور اس زمانے کی پراسرار طوالت کا جس میں ابلیس نے اپنی عبادتوں کے توسط سے ارتقا حاصل کر کے بزم ملائکہ میں جگہ پائی اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے:

فاعتبرو ابما کان من فعل الله بابلیس اذاحبط عمله ا لطویل و جهده الجهید ، و کان قد عبدالله ستة الآف سنة لا یدرئ امن سِنی الدنیاام سنی الاخرة... الخ۔[۲۹]

(ترجمہ: اللہ نے ابلیس کے ساتھ جو کیا اس سے عبرت حاصل کرو کہ اس کی طول طویل عبادتوں اور بھرپور کوششوں پر اس کے ایک پل کے گھمنڈ سے پانی پھیر دیا، جبکہ اس نے چھ ہزار برس تک جنکا پتہ نہیں دنیا کے سال تھے یا آخرت کے اس کی عبادت کی تھی۔)

چھ ہزار برس تک ابلیس نے خدا کی بارگاہ میں عبادت وسجدے کیے ان چھ ہزار برس کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آخر یہ اس دنیا کے زمان ومکاں کے حساب سے تھے یا اس زمان و مکاں کے مطابق تھے جو اس دنیا کے زمان و مکاں سے ماورا ہے اور جس کا ہر روز اس دنیا کے پچاس ہزار سالوں کے برابر ہوتا ہے ۔زمان و مکاں کے حوالے سے دنیا اور ماوراء دنیا کے درمیان پائے جانے والے اس تفوق کا قرآن پاک کی اس آیت سے استشہاد ہوتا ہے:

تعرج الملائكة و الروح اليه فی يوم كان مقداره خمسين الف سنة.[۳۰]

(ترجمہ: جس کی طرف فرشتے اور روح الامین چڑھتے ہیں یہ ایک دن میں اتنی مسافت طے کرتے ہیں جسکا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہوگا۔)

ابلیس نے اس قدر طویل زمانے تک خدا کی بارگاہ میں خضوع و خشوع بجا لاکر بلند ترین مقام و مرتبہ حاصل کیا۔اس کے اس مقام و مرتبہ پر فائز ہونے سے مقصد و غایت خلقت کا جو بنیادی فلسفہ اپنے خالق کی عبادت کرنے سے عبارت ہے واضح ہوتا ہے۔چناں چہ عبادت کی بدولت ہی تمام ملائکہ ، جنات اور انسان اپنے ارتقائی مراحل و مراتب کی جانب گامزن ہوسکتے ہیں ۔یہ عبادت ذوق وشوق اور آرزوؤں کے عناصرِ ترکیبی سے جب مملو ہوتی ہے تو انسانوں اور جنات کی اپنی ذات کی شناخت سے بڑھ کر ہستی مطلق کی شناخت کا باعث بنتی ہے۔ابلیس بڑے انہماک اور شوق کے ساتھ خدا کی عبادت و بندگی میں محو تھا کہ یکا یک خدا نے فرشتوں کے درمیان اعلان کیا کہ میں اپنا خلیفہ خلق کرنے والا ہوں، جو میری صفات سے متصف اور میری خلاقیت کا آخری شاہکار ہوگا:

و اذ قال ربُّک للملآ ئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفہ... الخ [۳۱]

(ترجمہ:اور اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں۔)

خدا کے اس خلیفہ یعنی آدم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ دوسری مخلوقات جیسے فرشتوں اور جنات وغیرہ کی بہ نسبت علم وحکمت میں ان سے بڑھ کر تھا یہ خصوصیت شاید اس امتیازی وصف پہ مشتمل تھی کہ آدم کو جونہی خدا نے کچھ علم و دانش کی نعمت سے نوازا تو اس نے اپنے غوروفکر اور تحلیل و تجزیہ کی استنتاجی قوت سے نئے سے نئے علمی نکات اور نتائج پیدا کیے۔اس امتیازی وصف سے شاید فرشتے اور ابلیس عاری تھے ۔آدم کی اس علمی برتری کا اعتراف قرآن حکیم اس طرح کرتا ہے:

وعلم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علیٰ الملائکہ فقال انبونی باسماء ھٰولاء اِن کنتم صادقین قالو سبحٰنک لا علم لنا الا ما

علمتنا انک انت العلیم الحکیم.قال یا آدم انبئھم باسما ئھم فلما انباھم باسمائھم ... الخ. [۳۲]

(ترجمہ: اور ہم نے آدمؑ کو سب چیزوں کے نام سکھائے پھر ان فرشتوں کے سامنے پیش کیا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ، تب فرشتوں نے اپنی عاجزی ظاہر کی اور عرض کیا کہ تو ہر عیب سے پاک و پاکیزہ ہے ہم تو صرف وہ جانتے ہیں جو تو نے سکھایا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے تو بڑا جاننے والاا ور حکیم ہے۔اس وقت خدا نے آدمؑ کو حکم دیا کہ اے آدمؑ تم ان فرشتوں کو ان سب چیزوں کے نام بتاؤ پس آدمؑ نے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتادیے۔)

جب فرشتوں پر علم و حکمت کے حوالے سے آدم کی برتری ثابت ہوئی تو خدا نے سب فرشتوں اور ابلیس استاد ملائک کو حکم دیا کہ اپنی فروتنی و انکسار کا اظہار کر کے آدم کے سامنے سر بسجود ہوجاو فرشتے تو سجدہ کرتے ہیں مگر ابلیس سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے۔کچھ ایسی روایتیں ہیں جو اس بات کا عندیہ دیتی ہیں کہ دراصل ابلیس آدم کی خلقت کے آغاز سے ہی ایک درونی کشمکش کا شکار ہو چکا تھا کہ شاید یہ نئی مخلوق مجھ سے بھی بڑھ کر اعلیٰ درجات تک نہ پہنچ جائے۔ اس خدشے کے پیش نظر ابلیس اندر ہی اندر آدم کے متعلق اپنی جاہ طلبی ،بغض وعناد اور تکبر کی وجہ سے جل بھن رہاتھا۔جونہی خدا نے فرشتوں کے ہمراہ اسے بھی سجدے کا حکم دے دیا تو اس کے یہ سبھی چھپے ہوئے عوارض ظاہر ہوگئے اور سجدہ نہ کرنے کی صورت میں ابلیس خدا کے کافروں میں داخل ہوکر شیطنت کا بانی اعظم قرار پا گیا:

واذ قلنا للملائکۃ اسجدو لآدم فسجدو الا ابلیس ابیٰ واستکبر وکان من الکٰفرین. [۳۳]

(ترجمہ: اور اس وقت کو یا دکرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا،اس نے غرور کیا اور کافر ہوگیا۔)

اس کفرو استکبار کے بعد ابلیس کو خدا کی طرف سے حکم ملتا ہے کہ ہماری بارگاہ سے نکل جاو کیونکہ یہاں کسی کو بلا استحقاق اپنی بڑائی جتانے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ابلیس جواب میں خدا سے مہلت

مانگتا ہے کہ مجھے روزِ آخرت تک مہلت دے کر بنی نوع انسان کے خلاف ایک ہمہ گیر جنگ و رستاخیز بپا کرنے کی فرصت دے تاکہ یہ پتا چلے کہ کون اس جنگ سے سرخرو ہو کر لوٹتا ہے اور کون سرخم ۔خدا ابلیس کی یہ درخواست قبول کر کے اسے قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت دے دیتا ہے:

قال فاخرج منها فانک رجیم، وان علیک لعنتی الیٰ یوم الدین قال رب فانظرنی الیٰ یوم یبعثون ، قال فانک من المنظرین ، الیٰ یوم الوقت المعلوم. [۳۴]

(ترجمہ: خدا نے ابلیس سے فرمایا آسمانوں اور ملائکہ کی صفوں سے نکل جا تو میرا راندہ درگاہ ہے اور یقیناً تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت ہوگی ۔ابلیس کہنے لگا میرے پروردگار مجھے اس دن تک کی مہلت دے دے جس دن انسان قبروں سے اٹھائے جائیں گے خدا نے فرمایا تجھے مہلت دی گئی ہے لیکن ایک معین دن تک کے لیے۔)

جب خدا ابلیس کو قیامت تک کی مہلت دے دیتا ہے تو ابلیس خدا کو چیلنج دے کر کہتا ہے کہ بنی نوع آدم کو میں اپنے عظیم امکانات ، حربوں اور ہتھکنڈوں سے تیری راہ سے منحرف کر کے ضرور مات دے دوں گا ،بس صرف کچھ ایسے لوگوں کو میں تیری راہ سے منحرف کر کے زیر نہیں کر سکوں گا جو تیرے مخلص پیروکار و پرستار ہوں گے۔ یہ ایسے لوگ ہوں گے جو تیرے لائحہ عمل کو اپنا سرمشق حیت بنا کر اس دنیا میں اپنے سارے قویٰ کو چاہے وہ مادی ہو یا روحانی آپ کے مقرر کردہ نظام حیات کے مطابق جلا بخشیں گے:

قال فبعزتک لاَغوینهم اجمعین،الا عبادک منهم المخلصین، قال فالحق والحق اقول لاملان جهنم منک وممن تبعک منهم اجمعین. [۳۵]

(ترجمہ: ابلیس نے کہا تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں تیرے مخلص بندے ہوں گے۔ اللہ نے فرمایا حق کی قسم اور میں حق ہی کہتا ہوں میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھر دوں گا۔)

اس ساری روئداد کوملحوظ رکھ کر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اسلام نے ایک منطقی اور مدلل پیرایے میں ابلیس اور اس کی وجہ شیطنت کو بڑے ٹھوس انداز میں پیش کردیا ہے،مزید یہ کہ ابلیس اور ابلیسیت کے آغاز و انجام ، ابلیس کی حیثیت و ماہیت کو بھی اسلام نے کسی منطقی جھول اور التباس کے بغیر واضح کردیا ہے ۔ مجموعی طور پر اسلام کا تصور ابلیس اس امتیازی وصف کا حامل ہے کہ اس سے خدا کی توحید افعالی اور قدرت مطلقہ پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا ہے ۔کیونکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے ابلیس کا وجود دوسرے ملل و مذاہب کی طرح کسی مستقل شرورانہ الوہیت کا حامل نہیں ہے یہی سبب ہے کہ اسلام فلسفۂ بدی وشر کے تعلق سے دوسرے ادیان کی طرح دوئیت یا ثنوی فکری آلائشوں سے دو چار نہیں ہوا۔خالق خیر و نیکی اور خالق شر و بدی اسلام کے مطابق دو جداگانہ وجود کے حامل نہیں ہیں بلکہ جو خدا خالق خیرو نیکی ہے وہی اسلامی تعلیمات کے مطابق ظاہراً جوہمیں سطحی طور پر شر و بدی نظر آتی ہے کا خالق بھی ہے۔

بہرحال انسانی ذہن میں جوسوال ابلیس کے تعلق سے موجزن رہتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان بندگئ خدا کے ذریعے سعادت وتکامل کے حصول کی خاطر خلق ہوا ہے تو ابلیس جیسے موجود کے وجود کے استمرار کے کیا معنی ؟ کیونکہ وہ انسان کے لیے ایک سرسخت حریف ہونے کے ساتھ ایسا موجود ہے جو انتہائی ذہین ،مکار وفریب کار اور کینہ پرور ہونے کے علاوہ اپنے ارادے کا پکا ہے جو انسان کے تکامل اور سعادت کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔لیکن اگر ذرا غور وفکر سے کام لیں تو یہ امر واضح ہوگا کہ اس سرسخت دشمن کا وجود بھی انسانوں کے ارتقاء وتکامل کے لیے ایک موثر ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔تجربوں سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جتنی زیادہ مزاحمت اور دشواریاں ایک انسان کوکسی ہدف ومقصد کو پانے میں پیش آتی ہیں اتنے ہی زیادہ امکانات و مواقع اسے آگے بڑھنے اورعروج حاصل کرنے کے لیے فراہم ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ ایک عزم محکم اور مقاومت و صبر و صلابت سے کام لے۔مزاحمت و مقاومت کے جوعظیم ثمرات حیاتیاتی (Biological) سطح پر انسان کوکلی طور پر حاصل ہوئے ہیں صاحب تفسیر نمونہ اس حوالے سے ایک فکر انگیز مثال پیش کرتے ہیں :

موجودہ زمانہ کے ماہرین مزاحمت کرنے والے جراثیموں کے وجود کے بارے میں کہتے ہیں : اگر وہ جراثیم نہ ہوتے تو انسان کے بدن کے خلیے سست اور کاہل ہوجاتے اور احتمال ہے کہ انسانوں کے بدن کی نشونماء ۸۰ سنٹیمیٹر سے زیادہ نہ ہوتی ، سب کے سب بونے آدمیوں کی صورت میں ہوتے اور اس طرح سے آج کے انسانوں نے مزحمت کرنے والے جراثیموں کے ساتھ جسمانی مقابلے کی وجہ سے زیادہ طاقت ونشونما حاصل کی ہے۔[۳۶]

بعینہ اسی طرح انسانی ذات شیطانی حربوں و ہتھکنڈوں اور ہوائے نفس سے مقابلہ کرکے بالیدہ ہوکر نشونماء اور ارتقا حاصل کرتی رہتی ہے ۔

اجمالی طور پر حکما و فلاسفہ فلسفہ شرور کے حوالے سے جس کے اجزائے ترکیبی میں ابلیس ایک اہم جز کے طور پر خاصا نمایاں نظر آتا ہے ، ابتدا سے ہی کافی متجسس ومتحیر نظر آتے ہیں ۔ آخر کس طرح ممکن ہے کہ جو خدا خیر و نیکی اور حسن و زیبائی کا خالق ہو وہی شر و بدی اور بدنمائی وناہنجاری کے ساتھ شیطنت کا بھی خالق تسلیم کیا جائے؟ یہاں پر پہلے جس مسئلے کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آیا ابلیس کی سرشت اپنی خلقت سے ہی شیطنت آمیز تھی یا نہیں۔اس حوالے سے کوئی دلیل یا اس طرح کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے کہ ابلیس ازل سے شرورانہ اور شیطنت آمیز سرشت کا مالک تھا۔ بلکہ ابلیس اپنی خلقت کے پہلے دن سے ہی دوسرے موجودات کی طرح ایک بےضرر اور پاکیزہ سرشت کا حامل تھا لیکن بعد میں انحراف و انحطاط اور شیطنت کا راستہ خود ابلیس نے اپنے ارادے سے چن لیا۔دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ابلیس کو ازل سے ہی شیطان صفت پیدانہیں کیا بلکہ اس نے خود ایسا عمل کیا کہ وہ شیطان بنا۔ بہر حال بدی وشرور کے اس پیچیدہ مسئلے کے متعلق فلاسفہ وحکماء کے ہاں جو ایک ذہنی الجھن اور تحیر پایا جاتا ہے اس کا اظہار اقبال ان الفاظ میں کرتے ہیں:

بہرحال یوں کائنات میں ہمیں ایک طرف کونی اور دوسری جانب اخلاقی شر سے سابقہ پڑتا ہے۔دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہیں اور دونوں سے

انکار کرنا ناممکن نہیں ۔پھر اس شر کی اضافیت یا اس کے پہلو بہ پہلو ان قوتوں کی موجودگی بھی جن سے اس کا ازالہ ممکن ہے ، ہمارے لیے باعث تسکین نہیں ہوسکتی کیونکہ اس اضافیت اور ازالے کے باوجود ہمیں اس کا بہر حال اثبات کرنا پڑتا ہے اور یہ اثبات اپنی جگہ پر بڑا خوفناک ہے۔لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کی خیر کا دامن اس شر سے جس کی کائنات میں اتنی فراوانی ہے کیسے جوڑ سکتے ہیں۔[۳۷]

اقبال اپنے اس تحیر آمیز بیان میں شر کے اضافی یا نسبی ہونے کا ذکر کرتے ہیں ، درحقیقت شر اضافی یا نسبی ہونے کے ساتھ ساتھ عدمی ہے یعنی برائی اور شرور کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے ۔جہاں شر کی حکمرانی ہوتی ہے وہاں پر دراصل خیر کا فقدان ہوتا ہے اور جونہی خیر کا ظہور ہوتا ہے تو شر کا قلع قمع ہوتا ہے۔شر کا خیر کے ظہور کے ساتھ ہی منحل ہونا دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ شر کا بدیہی اور بالاصالہ کوئی وجود نہیں ہے بلکہ شر کے استمرار کا انحصار خیر کے فقدان پر ہوتا ہے۔اس حقیقت کی وضاحت معروف فلسفی مرتضیٰ مطہری کے اس بیان سے ہوتی ہے:

وجود و عدم در خارج دو گروه جدا گانه را تشکیل نمی دهند۔ عدم هیچ و پوچ است و نمی تواند در مقابل هستی جای خاصی برای خود داشته باشد ۔ ولی درجهان طبیعت که جهان قوه و فعل ، حرکت وتکامل و تضادو تزاحم است همان جاکه وجود ها هستند عدمها نیزصدق می کنند۔وقتی از "نابینائی" سخن می گوییم نباید چنین انگاریم که "نابینائی"شی خاص و واقعیت ملموسی است که در چشم نابینا وجود دارد،نه " نابینائی" همان فقدان و نداشتن "بینائی" است و خود واقعیت مخصوصی ندارد۔[۳۸]

(ترجمہ: وجود و عدم خارجی عالم میں دو جداگانہ حقائق کو تشکیل نہیں دیتے کیونکہ عدم ہیچ ہے

جو سرے سے موجود ہی نہیں ہے لہٰذا وہ وجود کے مقابلے میں ہرگز کوئی واقعیت نہیں رکھتا ہے ۔لیکن عالم طبیعت جہاں قوہ وفعل، حرکت و تکامل اور تضاد و تزاحم ہے اس لیے یہاں وجو دات کے ساتھ ساتھ عدم کا عنوان بھی صادق آ جاتا ہے۔جب ہم نابینائی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ نابینائی نابینا انسان کی آنکھوں میں موجود کوئی مستقل اور قابل احساس حقیقت ہے جی نہیں بلکہ نابینائی اسی بینائی کا فقدان اور عدم ہے، ورنہ بجائے خود وہ کوئی باقاعدہ ومستقل حقیقت نہیں ہے ۔)

شیطان کی شیطنت اور بدی وشرور کسی مستقل حیثیت کے حامل نہیں ہیں بلکہ یہ محض نسبی و اضافی(Relative) ہے ۔یہ وقتی و عارضی وقوعے کے طور پر اس عالم میں انسان کے ارتقا اور فلاح و سعادت ابدی کی راہ میں ظاہراًحائل ہوتے ہیں مگر جب غائر نگاہوں سے دیکھئے تو یہ انسان کے لیے سد راہ نہیں بنتے بلکہ اس کے برعکس یہ اس کی اوج گیری میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں فقط اس شرط پر کہ انسان ان کے ساتھ مقابلے میں اپنی عظیم صلاحیتوں ، عزم و استقلال اور فدا کاری سے کام لیکر میدان عمل میں ڈٹ جائے ۔تب شیطنت شیطنت نہیں رہتی بلکہ یہ خیر و نیکی کی بصیرت حاصل ہونے کا ایک ذریعہ ثابت ہوتی ہے او ر اس کی مزاحمتیں مزاحمتیں نہیں رہتیں بلکہ یہ ہدف ومقصد کو پانے کے لیے ایک انگیزے میں بدل جاتی ہیں،ایک ایسے انگیزے میں جو شر پر بالآخر غلبہ حاصل کرکے اپنے منطقی اور امید افزا نتیجے پر منتج ہوتا ہے۔شر پر غالب آنے کے لیے انسان کو ذوق عمل ،حرکت پزیری اورعمل صالح کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا،شیطان اور شیطانی مظاہر کا وجود بھی دراصل انسانی زندگی کی اسی حرکت پزیری اور ہنگاموں ومعرکوں کے لیے ایک مہمیز کا کام دیتے ہیں۔انسانی حیات شیطان اور اس کے مظاہر کے ساتھ پنجہ آزمائی کی صورت میں جمود وتعطل سے محفوظ رہ کرتغیر وتبدل کی اس دنیا میں نئ سے نئ دنیاؤں اور منزلوں کی جانب رواں دواں رہتی ہے۔ شیطان کی اسی تحرک آگیں شخصیت کے پیش نظر اقبال اس کے وجود کو دنیا میں ایک ناگزیر امر کے طور پر مانتے ہیں :

مزی اندر جہانے کور ذوقے که یزداں دارد و شیطان ندارد[39]

(بہشت)

(ترجمہ: اس بے ذوق و بے ہنگامہ دنیا میں نہ رہ کہ جس میں خدا تو ہو مگر شیطان نہ ہو۔)

شیطان کی ہستی کا اگرچہ یہ پہلو ایجابی ہے کہ وہ انسان کو خیر و شر کی لڑائی میں حرکت و عمل کے لیے ایک مہمیز کا کام دیتا ہے مگر اپنے سلبی پہلو کی بنا پر جس میں ہر طرح کی برائیاں اور فسق شامل ہیں ایک مردود و ملعون موجود قرار پاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ امام راغب اصفہانی ، مفردات،جلد ۱، شیخ شمس الحق ۲۳۸کشمیر بلاک ،اقبال ٹاون لاہور،۱۹۸۷ء،ص، ۱۱۸،۱۱۹۔

۲۔ قرآن ، (تاج کمپنی لاہور)علیم بک ڈپو، دہلی، سنہ ندارد،سورہ ،روم ،آیت ۱۲۔

۳۔ ایضاً،سورہ انعام ،آیت ۴۴۔

۴۔ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی،مترادفات القرآن مع فروق اللغویہ،اسلامک بک فاونڈیشن ،نئی دہلی،۲۰۰۷ء،ص،۳۹۲۔

۵۔ مولانا ظفر نیازی، ابلیس کی داستان حیات المعروف شیطان کی سوانحعمری،آستانہ بک ڈپو ۱۵۶۵ سوئیوالان نئی دہلی، سنہ ندارد،ص،۳۰

۶۔ مالک رام ، حموربی اور بابلی تہذیب و تمدن ، مکتب جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی،۱۹۹۲ء، ص،۲۴۳،۲۴۴۔

۷۔ Paul Carus,The history of the Devil and the idea of evil from the earliest times to the present day,Sacred texts.com, May-Sept. 2002.pg,27.

۸۔ Ibid,17

۹۔ Ibid,28

۱۰۔ Abrar mohsin,Kamran mohsin, life in ancient civilization, Book Palace, Darya Ganj New Delhi, 2003, p98.

۱۱۔ Encyclopaedia Britannica, Vol-7, Encyclopaedia Britannica inc. (william benton Publisher) 1972, p227.

۱۲۔ محمد مظہرالدین صدیقی، اسلام اور مذاہب عالم تقابلی مطالعہ، فرید بکڈ پو،نئی دہلی،۲۰۰۵ء،ص،۴۔

۱۳۔ Paul Carus,The history of the Devil and the idea of evil from the earliest times to the present day, Sacredtexts.com, May-Sept.2002.pg76

۱۴۔ ملا مسیح پانی پتی ،رامایانا،مرکز تحقیقات فارسی رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران،دہلی نو،۲۰۰۹ء،ص،۳۴۲۔

۱۵۔ مولانا شمش نوید صاحب عثمانی،ترجمانی وتحریر ایس عبداللہ طارق، اگر اب بھی نہ جاگے تو،روشنی پبلشنگ ہاوس بازار نصراللہ خان رام پور،۱۹۸۹ء،ص،۱۷۸۔

۱۶۔ ایضاً،ص،۱۷۹۔

۱۷۔ علامہ اقبال،فلسفہ عجم،قاری پبلکیشنز ترکمان گیٹ دہلی،۲۰۰۶ء،ص، ۱۵۔

۱۸۔ محمد مظہرالدین صدیقی، اسلام اور مذاہب عالم تقابلی مطالعہ، فرید بکڈ پو،نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص،۴۴۔

۱۹۔ استاد شہید مرتضٰی مطہری،خدمات متقابل اسلام و ایران،انتشارات صدراقم ایران، ۱۴۳۸ھ،ص،۲۰۶، ۲۰۷۔

۲۰۔ محمد مظہرالدین صدیقی، اسلام اور مذاہب عالم تقابلی مطالعہ، فرید بکڈ پو،نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص،۴۷۔

۲۱۔ 21.Paul Carus,The history of the Devil and the idea of evil from the earliest times to the present day, Sacred texts.com, May-Sept.2002.pg,141.142.

۲۲۔ انجیل مقدس اردو(کتاب ایوبؑ)،انٹرنیشنل بائبل سوسائٹی،یو ایس اے،۲۰۰۵ء،ص، ۴۷۸۔

۲۳۔ انجیل برناباس اردو،فرید بکڈ پو،نئی دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۱۲۴۔

۲۴۔ سید مراد رضا رضوی،جن ایک قرآنی ،روائی اورعقلی تحقیق وتحلیل،انتشارات مرکز جہانی علوم اسلامی قم ایران،۱۴۲۸ھ،ص،۳۱۔

۲۵۔ سید مراد رضا رضوی،جن ایک قرآنی ،روائی اورعقلی تحقیق وتحلیل،انتشارات مرکز جہانی علوم اسلامی قم ایران،۱۴۲۸ھ،ص،۳۳۔

۲۶۔ قرآن ، (تاج کمپنی لاہور)علیم بک ڈپو ، دہلی ، سنہ ندارد، سورہ ،کہف،آیت ۵۰.

۲۷۔ ایضاً،سورہ رحمٰن،آیت،۱۵۔

۲۸۔ ایضاً،سورہ اعراف،آیت،۱۲۔

۲۹۔ حضرت علیؑ ، نہج البلاغہ،عباس بک ایجنسی رستم نگر درگاہ حضرت عباس لکھنو،۲۰۰۴،ص،۵۱۶۔

۳۰۔ قرآن ، (تاج کمپنی لاہور)علیم بک ڈپو ، دہلی ، سنہ ندارد، سورہ معارج،آیت،۴۔

۳۱۔ ایضاً،سورہ بقرہ،آیت،۳۰۔

۳۲۔ ایضاً،سورہ بقرہ،آیت،۳۱،۳۲،۳۳۔

۳۳۔ ایضاً،سورہ بقرہ،آیت،۳۴۔

۳۴۔ ایضاً،سورہ ص،آیت،۷۷،۷۸،۷۹،۸۰،۸۱۔

۳۵۔ ایضاً،سورہ ص،آیت،۸۲،۸۳،۸۴،۸۵۔

۳۶۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی ،تفسیر نمونہ،جلد۱۰،عباس بک ایجنسی رستم نگر درگاہ حضرت عباس لکھنو،۲۰۰۷،ص،۲۹۴۔

۳۷۔ علامہ اقبال،تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،اسلامی بک سنٹر،نئی دہلی،۱۹۹۲ء،۱۵۵،۱۵۶۔

۳۸۔ استاد شہید مرتضٰی مطہری،عدل الٰہی،انتشارات صدرا قم ایران،۱۴۳۸ھ،ص،۱۱۹۔

۳۹۔ کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور پاکستان،سنہ ندارد،ص،۳۰۲۔

باب دوم

ابلیس اور فلسفہ خودی و بے خودی

دنیائے فلسفہ اور فکر و نظر میں اقبال کا فلسفۂ خودی ایک نمایاں مقام و مرتبہ کا حامل مانا جاتا ہے۔ اقبال کا فلسفہ اور فکر و نظر بنیادی طور پر فلسفہ خودی کے محور کا ترجمان ہے۔ان کے اس فلسفہ خودی کی نشو نماء اور تشکیل کے پیچھے تاریخی طور پر علل و اسباب کا پر پیچ سلسلہ نظر آتا ہے۔ یونانی اور اسلامی فلسفیوں کا ایک نمایاں طبقہ انسان اور ساری ہستی کے وجود کو محض فریب نظر اور دھوکے سے تعبیر کرتا تھا۔ کیونکہ یہ فلاسفہ نظریہ وحدت الوجود کے داعی اور پرستار تھے جس کی رو سے ذات مطلق کے علاوہ ہستی کے سب مظاہر اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے ہیں۔اسلامی دنیا وحدت الوجود کے اس افلاطونی و نو افلاطونی نظریے کی زد میں تاریخ کے ایک خاص حساس مرحلے پر پوری طرح آ گئی اور ابن عربی کی فلسفیانہ موشگافیوں سے اس نظریے و عقیدے کی جڑیں پوری اسلامی دنیا میں مضبوط سے مضبوط تر ہوئیں۔اقبال اسرار خودی میں افلاطون اور اس سے متاثر شدہ ایسے مشرقی دنیا کے فلاسفہ،مفکرین اور شعرا کو جو نظریہ وحدت الوجود کے داعی بنے اپنی کڑی سے کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں اس نظریے و عقیدے سے انسان کی نفی ذات نفی انا یا دوسرے لفظوں میں نفی خودی کے ساتھ ساتھ نفی ہستی بھی لازم مانی جاتی رہی ہے۔جس کا منطقی نتیجہ انسان کا عملی طور پر ناکارہ اور فلج زدہ ہونے کی صورت میں بر آمد ہوتا تھا۔انہیں علل و اسباب اور اسی تاریخی و فکری پس منظر میں اقبال کا فلسفہ خودی نشو و نماء پا کر پروان چڑھتا ہے۔''خودی'' کیا چیز ہے؟ یہ سوال خود اقبال اپنے آپ سے یوں پوچھتے ہیں:

> یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں ۔یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔یہ''خودی'' یا ''انا'' یا''میں'' جو اپنے عمل کے رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کے رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے۔مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی کیا چیز ہے ؟[1]

اقبال خود ہی اس سوال کا جواب ان مختصر الفاظ میں دیتے ہیں :

اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے ۔[۲]

ایک معروف ادیب و محقق اور ماہر اقبالیات فلسفہ خودی کا ایک اجمالی تعارف یوں پیش کرتے ہیں:

''خودی'' کا لفظ اقبال کے پیغام یا فلسفہء حیات میں تکبر و غرور یا اردو فارسی کے مروجہ معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔خودی اقبال کے نزدیک نام ہے احساس غیرت مندی کا، جذبہ خودداری کا ،اپنی ذات و صفات کے پاس و احساس کا اپنی انا کو جراحت و شکست سے محفوظ رکھنے کا ،حرکت و توانائی کو زندگی کی ضامن سمجھنے کا ،مظاہراتِ فطرت سے بر سر پیکار رہنے کا اور دوسرں کا سہارا تلاش کرنے کے بجاے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال کے نقطہ نظر سے ''خودی'' زندگی کا آغاز ،وسط اور انجام سبھی کچھ ہے۔فرد اور ملت کی ترقی و پستی خودی کی ترقی و زوال پر منحصر ہے،خودی کا تحفظ اور خودی کا استحکام زندگی کا استحکام ہے۔ازل سے ابد تک خودی ہی کی کارفرمائی ہے اس کی کامرانیاں اور کارکشائیاں بے شمار اور اس کی وسعتیں اور بلندیاں بے کنار ہیں۔[۳]

احساسِ نفس اور تعین ذات کی رو سے یہ ہستی اور بالخصوص انسانی ذات اور اس کے حریف عناصر ایک آزادانہ وجود ، مستقل ارادے،نو بہ نو تخلیقی امکانات قوت بقا اور جہد مسلسل و عمل پیہم کے عظیم قویٰ سے معمور ہیں ۔انسان اور اس ساری ہستی کا وجود اسی ''ایغو'' یا خودی کے لا پیدا کنار تخلیقی امکانات اور آثار کا ایک نقش ہیں۔ بقول اقبال:

پیکر ہستی ز آثار خودی است   ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است[۴]

(اسرار خودی)

(ترجمہ :ہستی کا پیکر خودی کے آثار سے ہے، جو بھی تم دیکھتے ہو خودی کے اسرار سے ہے۔)

مزید برآں ہستی مطلق کی ماہیت خودی پر منحصر ہے۔ یہ ہستی مطلق ہی کی خودی ہے جو باقی تمام خودیوں کے لیے ایک منبع کی حیثیت سے سرگرم عمل رہتی ہے۔ذات مطلق نے اظہار ذات کے لیے تخلیق و ابداع کے گوناگوں جلوؤں سے کام لے کر منصۂ شہود پر دوسری فعال و سرگرم عمل خودیوں کو جنم دیا۔اس طرح ذات مطلق نے اپنی ذات وکنہ کا برملا اظہار اور اپنے بے حساب و ناقابل تصور تخلیقی جلوہ سامانیوں کا ثبوت فراہم کیا۔انفرادی حیثیت سے اپنی ذات وکنہ اور اپنے تخلیقی امکانات کا بر ملا اظہار کرنا خودی کے اصلی خصائص میں سے ہے۔بلکہ تخلیق و ابداع کے بلا ناغہ تسلسل اور سعی وعمل کے جوش وخروش سے ہی دراصل خودی کی حیات عبارت ہے۔یہ ایک ایسی حیات ہے جو عظیم سے عظیم تر تخلیقی معجزہ آفرینیوں سے سروکار رکھتی ہے۔تخلیق وتولید کی ان معجزہ آفرینیوں کو اپنے قوام و دوام کے لیے ایک مہیج کی اشد ضرورت ہوتی ہے جو آرزوؤں اور تمناؤں کے ایک عظیم سلسلے سے فراہم ہوتی ہے۔آرزوؤں اور تمناؤں کی یہ مہیج خودی کی حیات کو نئے سے نئے اور منفرد تخلیقی تجربوں سے ہمکنار کرتی ہے اور خودی کی یہ تمنائیں اور آرزوئیں عشق کے سوز و گداز سے حرارت پاتی ہیں۔ کارزار حیات میں خودی کو اپنے مقاصد و اہداف کی راہ کو سر کرنے کے لیے سخت سے سخت اور دشوار سے دشوار ترین طبیعی وفطری موانع کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہ سبھی موانع چاہے طبیعی ہوں یا فطری ،نفسیاتی ہوں یا اجتماعی خودی کو بے اثر و بے راہ رو کرنے کے لیے اپنے فطری اقتضاٰت کے تحت شدید مزاحمت اور پیکار کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔خودی اور مزاحمتوں کی اس باہمی رساکشی اور کشمکش میں خودی کو پنپنے اور پختہ تر ہونے کے لیے سازگار موقع تب ہاتھ آتا ہے جب وہ عشق کی روح اور سپر سے مزین ہو۔یہ عشق ایک ایمان وعقیدہ اور نصب العین کا حامل ہوتا ہے جب خودی عشق کے اعلیٰ و ارفع خصائص سے سرفراز ہوتی ہے تب وہ مزاحمتوں کے معرکے میں متنوع تجربوں اور بے انتہا تخلیقی اثر آفرینیوں سے سرفراز ہوتی ہے۔ڈاکٹرعشرت حسن انور درست کہتے ہیں:

> یہ تمنائیں عشق میں حد درجہ قوی اور مضبوط ہوجاتی ہیں۔عشق انہیں ایک نئی حیات،نیا سوز اور حرارت بخش دیتا ہے۔یہ صرف عشق ہی ہے جس میں

> آدمی ہمیشہ نئی آرزوؤں ،تمناؤں خواہشوں اور بے تابیوں کا مسلسل امنڈتا ہوا سیلاب محسوس کرتا ہے۔عشق زندگی کو ایک معنی اور ایک نئی قوت بخش دیتا ہے۔ایغو عشق سے مستحکم ہوتا ہے۔[۵]

بہرحال خودی کو جن بڑی مزاحمتوں اور تنگنائیوں کا سامنا ہوتا ہے ان میں موت اولیت کی حامل ہے۔موت انسانی اور مجموعی طور پر ذی روح موجودات کے لیے ایک خوف ناک اور یاس انگیز واقعیت کے بطور ہر آن موجود و متحرک رہتی ہے۔خودی کو بھی موت سے مفر نہیں مگر خودی اپنے آپ کو جاوداں بنانے کے لیے اپنے اعمال و افعال کی موثر ترین اور نقش آفرین صورت سخت کوشی و جانفشانی کی مثالی ہیئت میں پیش کرتی ہے۔جس سے خودی کی بقا کا حتمی سامان مہیا ہوتا ہے۔مگر خودی کے یہ متنوع اعمال و افعال اپنی سرشت و تاثیر، ہیئت و ترکیب اور بالخصوص اپنے نصب العینی رخ (Ideological Dimension) کی رو سے کسی بھی خوشگوار یا ناگوار انجام پر منتج ہوسکتے ہیں ۔خودی کی بقاء کے حوالے سے اعمال و افعال کے اس فیصلہ کن کردار کے متعلق اقبال کہتے ہیں:

> گویا زندگی وہ فرصت ہے جس میں خودی کو عمل کے لا انتہا مواقع میسر آتے ہیں اور جس میں موت اس کا پہلا امتحان ہے تاکہ وہ دیکھ سکے اسے اپنے اعمال و افعال کی شیرازہ بندی میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ اعمال کا نتیجہ نہ تو لطف ہے نہ درد۔اعمال یا تو خود کو سہارا دیتے یا اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔لہٰذا یہ امر کہ خودی فنا ہوجائے گی یا اس کا کوئی مستقبل ہے عمل پر موقوف ہے۔[۶]

خودی اعمال و افعال کی بھٹی میں تپ کر اور عشق کی حرارتِ سوزاں سے قوت و توانائی، سرگرمی و التہاب پا کر ہستی کے جملہ عیاں و پنہاں اسرار و رموز کو مسخر کرنے کے لیے کمر بستہ ہوتی ہے۔ہستی اپنے بطن میں لاتعداد فطری اسرار و قویٰ کو نشوونما فراہم کرتی ہے اور خودی نہ صرف فطرت کے ان اسرار و قویٰ کو اپنے دست اختیار میں لے کر انہیں مسخر کرتی ہے بلکہ وہ تازہ بہ

تازہ تخلیقی نقوش کا ایک نیے سے نیا عالم پیدا کرتی ہے۔خودی یوں اپنے خالق تبارک و تعالیٰ کی بنیادی صفت یعنی خالقیت سے متصف ہوکرانسان کو بھی مقصد آفرینی کی قدرت سے سرفراز کرتی ہے۔جس کے نتیجے میں انسانی قویٰ فطرت کے سامنے مجبور محض اور ایک بے دست و پا موجود کی حیثیت سے نہیں رہتے ہیں بلکہ اس کے برعکس وہ آزاد و بااختیار اور ایک استقلال کے مالک ہونے کی حیثیت سے اپنا تشخص قائم کرتے ہیں اس کے علاوہ وہ فطرت اور اس کے قوانین کو اپنی تمنیات و خواہشات کے مطابق ڈھالتے اور متشکل کرتے رہتے ہیں۔انسان یوں تقدیر کا طعمہ نہیں رہتا بلکہ تقدیر کو وہ خودی کی بدولت اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔کیونکہ خودی اپنی حیرت انگیز صلاحیتوں سے موجودہ حقائق کو مطلوبہ اہداف میں بدلنے کا ایک ملکہ و قدرت رکھتی ہے۔خودی کو اس قدرت و تسخیر کی صلاحیت و توانائی سے متصف و سرفراز ہونے کے لیے سخت و سنگین تربیت کی ضرورت پڑتی ہے اور اس تربیت و تہذیب کے تین بنیادی ارکان و مراحل اطاعت،ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی ہیں۔پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے جس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ خودی خودسری ،خودخواہی و جاہ طلبی سے کوئی سروکار نہیں رکھتی ہے۔خودی کی حیات میں صاحب اقتدار و صاحب اثر ونفوذ بننے کے لیے جو اولین شرط ہے وہ ایک حق بین وحق پسند آئین کی اطاعت ہے۔اطاعت سے انسان اور ان دیگر موجودات کو جن پر تشریعی علائق کا ایک سلسلہ نافذ ہے خودداری وخود اختیاری کا ایک ملکہ حاصل ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کو ایک حق پسند آئین کی پیروی سے دیگر خود ساختہ و ہلاکت خیز قوانین سے نجات ملتی ہے اس کے برعکس الٰہی قوانین کی پیروی سے انسان خدا طلب بننے کے ساتھ حق اندیش اور حق طلب بننے کی فضیلتِ عظمٰی سے سرفراز ہوتا ہے جس میں اس کے لیے قوت و تسخیر کا ایک ساماں پوشیدہ ہوتا ہے۔ بقول اقبال:

ھرکہ تسخیر مہ و پرویں کنند	خویش را زنجیری آئین کنند[۷]

(اسرار خودی)

(ترجمہ: جو بھی مہ و پرویں کو اپنے قبضے میں لیتا ہے وہ اپنے آپ کو پہلے ایک قانون کا پابند بنا لیتا ہے۔)

دوسرا رکن رکین جس سے خودی کی تربیت ہوتی ہے ضبط نفس کی منزل ہے۔نامشروع نفسانی خواہشات اور غرائز کی طغیانی کے سامنے اگر خودی تسلیم ہوجائے تو وہ مغلوب ومقہور ہو کے رہتی ہے۔کیونکہ خواہشوں اور دیگر طبیعی میلانات کا ابتذال آمیز استعمال ایک فرد کی جسمانی و روحانی توانائیوں کے سرچشمے کو خشک کرکے رکھ دیتا ہیں۔اس کے برخلاف جب ایک فرد اپنی تمام جسمانی و روحانی صلاحیتوں اور امکانات کو ایک جگہ پر مرتکز کر کے متوازن انداز میں کام میں لاتا ہے تو خودی کی تعمیر وتشکیل آسانی سے عمل میں آتی ہے۔ کیونکہ جب سبھی قوتیں ایک جگہ پر محفوظ رہتی ہیں تو انتشار کے امکانات کم سے کم تر ہوجانے کی وجہ سے فرد کو ایک عظیم جسمانی و روحانی قوت میسر آتی ہے جو مزاحمتوں کے مقابلے میں شکست ناپزیر بن کر اسے اپنے سرکش نفس کی حکمرانی کا موقعہ فراہم کرتی ہے۔اقبال نفس کی سرکشی اور اسے رام کرنے کے حوالے سے کہتے ہیں:

نفس تو مثل شتر خود پروراست
خود پرست و خود سوار و خود سر است

(ترجمہ: تیرا نفس اس اونٹ کی طرح ہے جو خود خواہ ،بے لگام وخودسر ہے۔)

مرد شو آور زمام او بکف
تا شوی گوهر اگر باشی خزف

(ترجمہ: مرد بن اور اس سرکش اونٹ کی لگام اپنے ہاتھ میں لے ،تب ایک سنگ ریزے سے ایک گوہر بن جاؤ گے۔)

امتزاج ماو طیں تن پرور است
کشتۂ فحشا ہلاک منکر است

(ترجمہ: جو فقط مٹی و پانی کا پتلا بن کر رہ جاتا ہے وہ صرف تن پروری میں لگ جاتا ہے۔ فساد وفحشا میں مبتلا ہوکر ہلاک ہونا کیسی مکروہ موت ہوتی ہے۔)

اہل قوت شو زور دِ یا قوی
تا سوار اشتر خاکی شوی[۸]

(اسرارخودی)

(ترجمہ: قوی و طاقتور (اخلاقی و روحانی اعتبار سے) بن جاؤ تاکہ اپنے سرکش نفس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے سکو۔)

اطاعت اور ضبط نفس کے بعد جو سب سے اہم منزل آتی ہے وہ نیابت الٰہی کی منزل ہے۔ اطاعت اور ضبط نفس کی منزلیں ہی دراصل فرد کو نیابت الٰہی کے عظیم منصب پر فائز ہونے کا سبب بنتی ہیں۔اس عظیم منصب پر فائز ہوکر فرد خدا کی کارسازی و جلوہ گری میں ایک طرح سے شامل ہوتا ہے۔مشیت ایزدی اور اس کی قدرت مطلق کے سامنے تمام ہستی مہر و ماہ سے لیکر آب و باد و خاک تک غرض سبھی اشیاء دست بستہ ہیں۔ جو انسان اطاعت و ضبط نفس کی منزلوں کو طے کر کے نیابت الٰہی کے تکوینی وتشریعی منصب پر اپنی خودی کو پہنچاتا ہے تو مشیت ایزدی سے اسے تصرف وتسخیر کی قوت تفویض ہوتی ہے جس سے فرد اس عالم ہستی کی تمام اشیاء کو اپنے دست تصرف میں لینے پہ قادر بن جاتا ہے۔ یہی وہ مقام و مرتبہ ہے جس کے متعلق اقبال کہتے ہیں:

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است

(ترجمہ: انسان کا دنیا میں خدا کا نائب ہونا ایک مستحسن چیز ہے۔عناصر یعنی قویٰ فطرت پر انسان کا حکمران بننا ایک پسندیدہ امر ہے۔)

نائب حق ہمچو جان عالم است
ہستی او ظل اسم اعظم است

(ترجمہ: خدا کا یہ نائب انسان اسی کی طرح عالم کی جاں ہے اور اس کی ہستی خدا کے اسم اعظم کا ایک سایہ ہے۔)

فطرتش معمور و می خواہد نمود
عالمے دیگر بیارد در وجود[9]

(اسرارخودی)

(ترجمہ: اس نائب حق کی فطرت الٰہی صفات سے معمور ہے اس لیے وہ اپنی ذات کی جلوہ آرائی کے لیے ایک نئے سے نئے عالم کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔)

یہاں پر یہ اندیشہ دامن گیر ہوتا ہے کہ اقبال انسان کو خداوندی کے بالکل نزدیک لے جاتا ہے مگر غور سے دیکھیں تو یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ قرآن حکیم میں ایسے بہت سے رموز و کنایات ہیں جو یہ نکتہ واضح کرتے ہیں کہ جب انسان اپنے آپ کو تکوینی وتشریعی طور پر خدا کی مشیت کے سامنے تسلیم کرتا ہے تو اس کے تمام افعال و اعمال خدا کے لیے اور خدا کی راہ میں انجام پاکر خود بہ خود خدائی کا رنگ اختیار کرتے ہیں ۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم:

> ''مارمیت*'' کی آیت کے علاوہ بھی اور کئی آیات اس نظریے کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔[۱]

اقبال کے فلسفہ خودی کا دوسرا رخ بے خودی پر مشتمل ہے ۔ بادی النظر میں ایسا لگ رہا ہے کہ اقبال فلسفہ خودی کے حوالے سے تضاد اور تناقض کے شکار ہے۔ کیونکہ جہاں وہ فرد کو اپنے آپ کو پانے اور اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کا درس فلسفہ خودی کی صورت میں دے رہے ہیں وہیں اسے اپنے آپ کو کھونے کی تلقین بے خودی کے روپ میں کررہے ہیں۔ مجموعی طور پر جب ایک سطحی انداز میں دیکھتے ہیں تو اقبال کا فلسفہ خودی تضادات کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے ۔ اس صورت حال کے پیش نظر خود اقبال اپنے ایک خط میں وضاحتاً اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں:

> آپ مجھے تناقض کا ملزم گردانتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں ، میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچی بیخودی سے پیدا ہوتی ہے یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہوتی ہے، مگر ایک بیخودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو عاشقانہ شاعری کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے یہ اس قسم سے ہے جو افیون وشراب کا نتیجہ ہے۔ دوسری وہ بیخودی ہے جو بعض صوفیاء اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذات باری میں فنا کردینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذات باری میں ہے نہ احکام باری میں ۔پہلی قسم کی بیخودی تو ایک حد تک مفید ہوسکتی

---

* فلم تقتلوهم ولكن اللّٰه قتلهم ومارميت اذرميت ولكن الله رمىٰ... الخ (سورہ : الانفال،آیت،۱۷)
(ترجمہ: اے مسلمانو ان کفار کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ خود خدا نے ان کو قتل کیا اور اے رسولؐ تم نے تیر نہیں مارا بلکہ یہ تیر خود خدا نے مارا۔)

ہے مگر دوسری قسم کی بیخودی تمام مذاہب و اخلاق کی جڑ کاٹنے والی ہے۔
میں ان دوقسموں کی بیخودی پر معترض ہوں اور بس حقیقی اسلامی بیخودی
میرے نزدیک اپنی ذاتی اور شخصی میلانات و رجحانات وتخیلات کو چھوڑ
کراللہ کے احکام کے پابند ہوجانا ہے یہی اسلامی تصوف کے نزدیک فنا ہے
البتہ عجمی تصوف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے۔[11]

اس طویل اقتباس سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ اقبال کے معاصر اہل فکر ونظر فلسفہ خودی و بے خودی کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیتے تھے اور یوں وہ اقبال کو اس حوالے سے ذہنی تناقض اور فکری خلفشار کا شکار مانتے تھے۔ جبکہ فلسفہ خودی و بے خودی فرد اور جماعت کی انفرادی ذات اور تعینِ نفس کی رو سے ایک متوازن اور اعتدال پر مبنی فلسفہ حیات ہے۔ اس میں کچھ مغربی فلسفیوں اور بعض اسلامی مفکرین کی طرح فرد اور جماعت کے متعلق یعنی خودی و بے خودی کے تعلق سے افراط وتفریط پر مشتمل ایک تباہ کن وتخریبی عنصر نہیں پایا جاتا ہے۔ان فلسفیوں اور مفکرین میں بعض ایسے تھے جو صرف فرد کی مطلق انانیت پر زور دیتے تھے اور ملت و معاشرے کو فرد کے بالکل عین مخالف قرار دیتے تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ معاشرتی حدود و قیود اور اجتماعی مصلحتیں فرد کی ارتقاء ذات اور اس کی مجموعی تعمیر وتشکیل کی راہ کو مسدود کرنے والی چیزیں ہیں۔ اس کے برعکس کچھ ایسے مفکرین تھے جو جماعت اور مملکت کی اصالت وجود کے حامی تھے اور فرد کو اس ہیئت ترکیبی کا ایک نہ چنداں اہم عنصر اور جز کی حیثیت سے قبول کرتے تھے غرض ان کے سامنے جماعت ومملکت کا ایک بت تھا جس کے سامنے فرد کی انفرادیت کی کوئی قیمت نہ تھی۔ اس کے برخلاف اقبال کا فلسفہ خودی و بے خودی حیات کا ایک متوازن ومعقول نظام پیش کرتا ہے۔ اس نظریہ حیات میں نہ فرد کی انانیت کا افراطی رخ ملتا ہے اور نہ فرد کا جماعت کے مقابلے میں عدم وجود پر مبنی تفریطی رجحان ۔دراصل بے خودی کا نظریہ اقبال کے ہاں فلسفہ خودی کا تتمہ ہے کیونکہ بے خودی سے خودی پر مشتمل نظریہ حیات اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے بقول خلیفہ عبدالحکیم:

اقبال کے حکیمانہ اور دینی تصورات کا فقط ایک پہلو اسرار خودی میں پیش ہوا
تھا اس کی تکمیل کے لیے دوسرے پہلو کو پیش کرنا لازمی تھا۔رموز بے خودی
اسرار خودی کا تکملہ ہے ۔ اقبال کے نظریات حیات میں بحیثیت مجموعی ایک
توازن موجود ہے۔[۱۲]

جس توازن کی بات خلیفہ عبد الحکیم کرتے ہیں وہ اصولی طور پر فرد اور معاشرے کے درمیان پایے جانے والے اساسی رابطے میں پایا جاتا ہے۔ ملت افراد کی تعمیر وتشکیل میں اپنا فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے اور افراد ملت کی تشکیل کا فریضہ انجام دیتے ہیں یعنی افراد کی خودی ملت سے تشکیل پاتی ہے اور ملت یا معاشرے کی خودی افراد سے ترکیب پاتی ہے۔ جہاں خودی فرد کو اپنی قوتوں اور تمام ممکنہ روحانی وجسمانی ظرفیتوں کا عرفان حاصل کرنے کے بعد ان سے اپنی ذات کی تعمیر کرنے کی غرض سے بہرہ مند ہونے کی تلقین کرتی ہے وہیں اسے اپنی ذات کے خول سے پرے اٹھنے کا پیام دے کر اسے جماعت کے عظیم تر مقاصد و اہداف میں شریک کار ہونے کے لیے اسے بے خودی کی صورت میں ایک منظّم لائحہ عمل بھی عطا کرتی ہے۔ فرد اگر ایک ملت و معاشرے کا روحِ رواں ہے تو ملت جسد اور ایک ایسی شفیق گود کی حیثیت رکھتی ہے جس میں فرد پرورش پا کر اپنے کمال کو پہنچتا ہے ۔ بقول اقبال:

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوہر او را کمال از ملت است[۱۳]

(رموز بیخودی)

(ترجمہ: فرد کا اپنی جماعت کے ساتھ رابط فرد کے لیے رحمت ہے ،کیونکہ اس کا جوہر (خودی) اسی ملت کی بدولت اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔)

ملت اور فرد کا باہمی ارتباط اور دونوں کی شیرازہ بندی ایک عظیم تر نصب العین وعقیدے کی روشنی میں معرض وجود میں آتی ہے اور وہ نصب العین ونشان راہ عقیدہ توحید و رسالت ہیں ۔ ملت اسلامیہ جو اقبال کے فلسفہ حیات (خودی و بے خودی) کی رو سے ایک آئیڈیل ہئیت

اجتماعی ہے کے اساسی ارکان یہی توحید و رسالت ہیں۔کلمہ توحید ملت اسلامیہ کی پہچان کا ذریعہ ہے مزید برآں یہ عقیدہ توحید ہی ہے جس سے ملت کی تعمیر وتشکیل اور حیات کا سامان بہم پہنچتا ہے ۔ملی زندگی کا کوئی بھی بعد ہو ؛فکری و اجتماعی ،سیاسی و اقتصادی یا تخلیقی جب توحیدی ڈھانچے پہ استوار ہوتو ملت اقبال کی نظر میں ساری نوع انسانی کے لیے ایک نمونہ عمل بن جاتی ہے۔ ان کے مطابق لاالہ کے آفاقی نصب العین سے ملت انسان کے خود ساختہ جغرافیائی حدود و قیود اور نسل پرستی وقومی عصبیت کے جیسے ابلیسی مظاہر کی بیخکنی کرنے کے ساتھ ساتھ پوری نوع انسانی میں وحدت فکری کے ہمراہ وحدت عملی کو بھی یقینی بناتی ہے۔نتیجتاً انسان کے لیے دوسروں پر اپنی نسلی و قبائلی ،لسانی وقومی بالا دستی قائم کرنے کی سب راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ جب یہ سب غیر انسانی اور ابلیسی امتیازات ختم ہوتے ہیں تو ساری انسانی برادری اور سارے اقوام ایک ایسی انسانی اکائی اور جغرافیائی وحدت کو معرض وجود میں لاتے ہیں؛جس میں نہ گورے وکالے ،نہ اعلیٰ و ادنیٰ اور نہ ہی شام وروم کا کوئی امتیاز باقی رہتا ہے۔ اسی خاطر اقبال کلمہ توحید کو انسانی برادری اور بالخصوص اسلامی امت کے پیکر کا ایک اساسی عنصر قرار دیتا ہے اور اس کے علاوہ امت کے فکری وعملی انسجام کا بھی اسے واحد ذریعہ مانتے ہیں۔ بقول انکے:

ملت بیضا تن و جاں لا الہ
ساز مارا پردہ گرداں لا الہ

(ترجمہ:ملت اسلامیہ کا جسد و جاں کلمہ توحید ہے اور اسکے ساز کا پردہ کلمہ توحید قرار پائے۔)

لاالہ سرمایہ اسرار ما
رشتہ اش شیرازہ افکار ما[۱۴]

(رموز بیخودی)

(ترجمہ: کلمہ توحید امت کے اسرار کا سرمایہ ہے اور اسی کلمہ توحید سے امت کے افکار کے شیرازے کا تانا بانا ہے۔)

جب امت اپنی حیات اور اپنے افکار کا نصب العین کلمہ توحید کو بنالیتی ہے تب خوف و

ہراس کے وہ سب ذرائع جو اس دنیا وہستی میں پائے جاتے ہیں اس کے سامنے بے اثر ہوکر رہ جاتے ہیں۔خوف و ہراس اور یاس و ناامیدی ملت کے ذوق وشوق اور ذوق نمو د و پیکار کو سست و سرد کرنے کا ایک خطرناک باعث ہے مگر کلمہ توحید کی گرمی وحرارت اور پشت پناہی سے خوف و ہراس کے سب ذرائع نابود ہوتے ہیں۔مسلمان کے لیے قوت و جبروت اورصلابت و استقامت کا سرچشمہ توحید ہے ۔ جب اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا نقش ثبت ہوجاتا ہے تو وہ بڑے سے بڑے طاغی کے سامنے بھی سرخم نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہوتا۔وہ ہرصورت میں حق پر ثابت قدم رہتا ہے اورحق کے راستے کو دشوار سے دشوار تر حالات میں بھی نہیں چھوڑتا ہے مزید برآں اسے کسی قسم کا حرص وطمع حق کے راستے سے متزلزل نہیں کرتا۔ بقول اقبال:

چو کلیمی سوے فرعونی رود
قلب او از لا تخف محکم شود

(ترجمہ: جب موسیٰ فرعون کے پاس جاتا ہے تو اس کا دل خدا کے اس امر سے مضبوط اورمحکم ہوتا ہے کہ ''اے موسیٰ تم خوف مت کھاؤ''۔)

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروان زندگی رارہزن است[۱۵]

(رموز بیخودی)

(ترجمہ: غیر اللہ کا خوف عمل کا دشمن ہے اور زندگی کے کاروان کے لیے یہ خوف وہ خوف ثابت ہوجاتا ہے جو ایک کاروان کو رہزنوں سے لاحق ہوتا ہے۔)

رسالت توحید کی طرح امت کا ایک اہم اور اساسی رکن ہے۔ اگر کلمہ توحید ملت کے لیے ذہنی وفکری افق کوتشکیل دینے والا ایک جز لاینفک ہے تو رسالت ملت کے لیے عملی سرمشق حیات ٹھہرتی ہے۔ افراد کی بے خودی سے جب ملت کی خودی معرض وجود میں آتی ہے تو رسالت ملت کو عملی طور پر ایک ایسا نقشہ راہ دکھاتی ہے جو فرد و ملت کو وحدت وانسجام کے راستے پر گامزن کرتی ہے۔ رسول ونبی ملت اور تمام نوع انسان کے لیے ایسا عملی نمونہ و اسوہ ہوتا ہے جو خدا کی

طرف سے حیات بخش و انسان ساز پیام لے کر نوع انسان کو تسخیر عالم کا ایک نسخہ و آئین عطا کرتا ہے۔اس کے علاوہ نبوی افکار و تعلیمات میں بنی نوع انسان کو حریت و مساوات کی تعلیم سے نوازنا ایک اہم ترین فریضہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ تعلیمات انسان کو تمام غیر انسانی و غیر اخلاقی جکڑ بندیوں سے نجات دے کر اسے نسلی و قبائلی ، لسانی و جغرافیائی جیسی مصنوعی جکڑ بندیوں سے آزادی فراہم کر کے ایک ہمہ گیر اخوت و برادری کی لڑی میں پروتی ہے۔ اس ہمہ گیر اخوت و برادری کے سامنے زمانی و مکانی محدودیتیں اور رکاوٹیں اپنا رنگ کھوتی ہیں ۔ اس واقعیت کو مدِ نظر رکھ کر یوں مسلمان کے نقطۂ نظر اور نصب العین کی رو سے زمانی و مکانی ، جغرافیائی اور دیگر محدودیتیں عبث بن جاتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں مسلمان کے لیے یہ سارا کرہ ارض وطن کے مترادف بن جاتا ہے جس کی بس ایک سرحد ہوتی ہے اور وہ سرحد اسلام پر مبنی ہوتی ہے۔ رسالت کی ان برکتوں کا اقبال یوں تذکرہ کرتے ہیں:

از رسالت درجہان تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما

(ترجمہ: رسالت کی بدولت دنیا میں ہمارا وجود ہے اور رسالت ہی سے ہمارا دین و آئین ہے۔)

از رسالت صد ہزار ما یک است
جز وِ ما از جزو ما لاینفک است [۱۶]

(رموز بیخودی)

(ترجمہ:رسالت ہی کے طفیل ہم لاکھ ہو کے بھی ایک ہے اور ہمارا ہر جز ایک دوسرے سے نا قابل جدائی ہے۔)

اقبال کے اس عالم گیر اخوت و وطنیت کے نظریے پر جو خدا کی وحدانیت اور رسالت محمدیؐ کے عقیدے پر استوار ہے یہ اعتراض ہوا کہ دنیا میں فقط امت مسلمہ ہی تمام انسانی برداری کو تشکیل نہیں دیتی ہے بلکہ برخلاف اس کے مسلمان دنیا کی انسانی آبادی کے ایک چھوٹے سے حصے کو تشکیل دیتے ہیں اور بقیہ انسانی آبادی دنیا کے دوسرے مختلف ادیان کی پیروکار ہیں۔ اس لیے اس حقیقت کو مدِ نظر رکھ کر اقبال کا مجوزہ عالم گیر اخوت و امومت پر مبنی پیام کس طرح قابل

عمل اور قابل قبول ہوسکتا ہے؟ اس پہ مستزاد یہ کہ اقبال پر فرقہ پرست ہونے کا الزام لگا کیونکہ ناقدین و معترضین کی نظر میں انکا فلسفہ حیات ایک خاص مذہب پر مبنی اور ایک خاص گروہ یا فرقے کے لیے تھا نہ کہ تمام نوع انسانی کے لیے۔ اس اعتراض کا جواب وہ یوں دیتے ہیں کہ اسلام کا مطمح نظر عالم گیر اخوت و محبت کا ہے مگر جب تک عملی طور پر ایک ملت اس اخوت و محبت کی ایک نہایت درخشندہ مثال قائم نہیں کرتی تب تک نوع انسانی کے لیے اس پیام و فلسفہ حیات کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں ہے۔ چناں چہ مذکورہ بالا اعتراض کے حوالے سے اقبال ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں، بلکہ میری قوت طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا بین مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ ،رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ [۱۷]

خودی و بے خودی کے فلسفے کی ہئیت ترکیبی سے اس اجمالی آشنائی کے بعد ابلیس کا فلسفہ خودی و بے خودی سے جو تعلق ہے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ اقبال کے مطابق ابلیس قوتِ طلب و جستجو ،سوز و ساز اور تخلیق مقاصد کا ایک مظہر ہے ۔ اور یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ انکا فلسفہ خودی پر مشتمل نظام حیات عملِ پیہم، ذوق و شوق اور حرکت مستمرہ سے عبارت ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ خودی کے مذکورہ عناصر ترکیبی ابلیس کی شخصیت میں بدرجہ اتم دکھائی دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ خودی کے اہم ترین مظاہر میں سے ایک ٹھہرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابلیس خودی کے نقطۂ نظر سے ایک معنوی کردار کے طور پر اقبال کے فلسفہ خودی میں ایک مقام کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ قول اس حوالے سے بڑا ہی چشم کشا ہے:

خودی کی مختلف جہتیں اور کئی مظاہر ہیں۔شیطان بھی خودی کا ایک مظہر ہے
اقبال چونکہ اثبات خودی اور حرکت کے شاعر ہیں ، اس لیے وہ شیطان کی
متحرک شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ [۱۸]

حرکت وعمل ہی دراصل زندگی کو ایک جہت اور ہدف و مقصد کا نقشہ دکھاتی ہے اور یہ حرکت وعمل ہی ہے جو زندگی کو درپیش مزاحمتی عناصر کا مردانہ وار مقابلہ کرکے زندگی کو سکون محض اور جمود وتعطل سے نکال کر حیات وجاوداں کے اعلیٰ سے اعلیٰ ارتقائی مدارج کا راستہ طے کرواتی ہیں۔اس طرح انسانی زندگی کے سامنے یوں لامتناہی مقاصد اور بے کراں مقامات کا ایک نئے سے نیا افق روشن ومنور ہوتا ہے۔ اقبال حرکت وعمل کے اس حیات آفرین نکتے کی یوں ترجمانی کرتے ہیں:

در عمل پوشیدہ مضمون حیات
لذت تخلیق قانون حیات

(ترجمہ: حیات کا مضمون عمل میں پوشیدہ ہے۔تخلیقی عمل میں ہی لذت حیات پنہاں ہے۔)

خیز و خلاق جہانِ تازہ شو
شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو

(ترجمہ: اٹھ اور نئے جہان کا خالق بن۔باطل کی آگ کو جڑ سے ختم کر یعنی آتش نمرود کو ختم کرکے ابراہیمؑ کی طرح دنیا میں بن جا۔)

با جہان نا مساعد ساختن
ہست در میدان سپر انداختن

(ترجمہ: ناموافق دنیا کے ساتھ ساز باز کرنا ایسا ہے کہ تم میدان جنگ میں اپنی ہار تسلیم کرنے کے مترادف ٹھہر جاو۔)

مرد خود داری کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بسازد روزگار

(ترجمہ: اس کے برعکس مرد خوددار و پختہ کار کے سامنے خود زمانہ سر تسلیم خم ہوتا ہے۔)

گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں[19]

(اسرارِ خودی)

(ترجمہ: اگر اس کے مقاصد کے ساتھ دنیا موافقت نہیں کرتی تو وہ آسماں یعنی حالات کے ساتھ جنگ آزما ہوتا ہے۔)

ابلیس آدم کو جنت کی پرسکون و بے حرکت زندگی سے ایک خطا کے باعث نکلواتا ہے یوں وہ سکون و جمود کی ایک بے حرکت و بے ہنگامہ زندگی کو پیچھے چھوڑ کر دنیا کی ایسی پر کشاکش و پراز پیکار زندگی کا سامنا کرتا ہے جو سراسر سوز و ساز اور آرزوؤں کے معرکوں سے لبریز ہیں ۔ ابلیس یوں آدم کے لیے حرکت وعمل کا سبب و سرچشمہ بن کر اسے خیر وشر پر مبنی دنیا میں ایک نبرد عظیم کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ ابلیس آدم کو سجدہ نہ کرکے اپنی خوداختیاری و خود ارادی کا ثبوت دیتا ہے جو آدم کے لیے ایک چشم کشا اشارہ ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی خود اختیاری و خود ارادی کی زندگی ہے جس کی روح حرکت وعمل ہے۔ جنت میں آدم حرکت وعمل اور خود اختیاری وغیرہ کی رو سے ایک تعطل سے دو چار تھے ابلیس انھیں مکروفریب کی بنا پر خطا کروا کے اس تعطل خیز زندگی سے چھٹکارا پانے اور اسے خیر باد کہنے کا باعث بن کر اسے نئی سے نئی دنیاؤں کی تخلیق و اکتشاف کا ضمیمہ فراہم کرتا ہے۔ بقول اقبال:

کوثر و تسنیم برد از تو نشاط عمل
گیر زمینائے تاک بادہ آیئنہ فام

(ترجمہ: ابلیس آدم سے کہہ رہا ہے کہ کوثر وتسنیم "جو تجھے بلا جستجو وعمل حاصل ہوئی" نے تم کو ذوق و نشاط عمل سے بیگانہ کردیا ہے۔ سرور ومستی اسی شراب سے حاصل ہوتی ہے جو تم خود اپنے ہاتھوں سے انگوروں کی بیلوں سے کشید کرو گے۔)

خیز کہ بنمایمت مملکت تازہ
چشم جہاں بیں کشا بہر تماشا خرام[20]

(تسخیر فطرت۔اغوائے آدم)

(ترجمہ: اٹھ کہ میں تجھے ایک نئی دنیا سے روشناس کراتا ہوں ،اپنی آنکھیں وا کر اور دنیائے انقلاب کے تماشے دیکھ۔)

ابلیس دنیا کی خیر و شر پر مبنی ہنگامہ آرائی اور آدم کے مجبوری سے مختاری سے سرفراز ہونے جو درحقیقت حرکت و عمل کا باعث ہے کا سہرا بھی اپنے سر باندھتا ہے:

شعلہ ہا از کشت زار من دمید
او ز مجبوری بہ مختاری رسید

(ترجمہ: ابلیس کہتا ہے کہ یہ میرا ہی ذوق عمل تھا اور میرے ہی کشت زار یعنی وجود سے حرکت کے شعلے اٹھے جن کی بدولت میں نے آدم کو بہکا کر اسے دنیا کی راہ دکھائی یوں وہ مجبوری یا جمود سے چھٹکارا پا کر مختاری و ذوق عمل سے سرفراز ہوا۔)

زشتی خود را نمودم آشکار
باتو دادم ذوق ترک و اختیار[۲۱]

(نمو دار شدن خواجہ اہل فراق ابلیس)

(ترجمہ: اور میں نے اپنی بدی کا اظہار کر کے آدم کو سجدہ نہ کیا اور اسے بہکا کر تم پہ یہ آشکار کر دیا کہ تم ترک و اختیار کی صفت سے متصف ہو، خدا نے تمہیں مجبور محض پیدا نہیں کیا ہے۔)

ان حقائق کے پیش نظر ابلیس اقبال کے نقطۂ نظر سے حرکت و عمل اور اس سے جڑے دوسرے انسلاکات یعنی جستجو و آرزو وغیرہ جو خودی کے بنیادی اعمال و اجزاء ہیں کا ایک بارز نمونہ ٹھہرتا ہے۔علاوہ بریں اقبال ابلیس کو حرکت کا سرچشمہ مانتا ہے۔ذیل کے اشعار سے اس حقیقت کی نقاب کشائی اقبال یوں کرتے نظر آتے ہیں:

می تپد از سوز من خون رگ کائنات
من بہ دوِ صر صرم من بہ غوِ تندرم

(ترجمہ: ابلیس کہتا ہے میرے ہی سوز سے اس دنیا میں یہ زندگی اور حرکت ہے ۔ میں ہی طوفان کی حرکت کا باعث ہوں اور میرے ہی وجہ سے بجلی کی چمک ہے۔)

از زومِن موجہ چرخ سکون ناپذیر
نقش گر روز گار تاب و تب جوہرم [۲۲]

(تسخیر فطرت ۔انکارِ ابلیس)

(ترجمہ: میرے دریا کی روانی وحرکت سے آسمان کی موج و گردش ہے اور میری ہی ذات سے اس کائنات میں تب وتاب اور چہل پہل کے نقوش ہیں۔)

خودی کا دوسرا اہم پہلو جو ابلیس کی شخصیت میں برجستہ انداز میں اپنی موجودگی کا پتہ دیتا ہے وہ تخلیق و تولید مقاصد کا ہے۔ فلسفہ خودی کی رو سے خودی کی حیات نئے سے نئے اور اچھوتے تخلیقی تجربات کا ایک انمٹ نقش معرض و جود میں لاتی ہے ۔ اپنے ان منفرد تخلیقی تجربات کی قوت سے خودی تسخیر فطرت پر کمر بستہ ہوتی ہے۔ فطرت کے مظاہر اور کائنات کی پراسرار قوتیں خاک سے لیکر افلاک تک خودی کی کمند میں اسیر ہیں ۔فتح یابی وتسخیر کی یہ آرزوئیں ذوق نمود اور تخلیق سے برآوردہ ہوتی ہیں۔ اگر اس ذوق تخلیق وتولید میں کوئی رخنہ آجاتا ہے تو خودی شکست و ریخت کا شکار ہوتی ہے۔ بقول اقبال:

چوں ز تخلیق تمنا باز ماند
شہپرش بشکست و ازپرواز ماند

(ترجمہ: جب خودی تخلیق کی تمنا کو چھوڑتی ہے تو اس کے پروبال ٹوٹ کروہ پرواز کرنے سے محروم رہتی ہے۔)

ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم [۲۳]

(اسرار خودی)

(ترجمہ: ہم تخلیق یعنی خودی کے مقاصد سے زندہ ہیں اور آرزو کی شعاع سے ہم تابندہ ہیں۔)

تخلیق وآفرینش کی یہ قوت ابلیس میں اضافی (Relatively) ہونے کے باوجود

بڑے نمایاں انداز میں موجود ہے۔ ابلیس آدم کا ایک ہمہ عیار حریف ہونے کے ساتھ خداوندتعالیٰ کا حریف بھی ہے اس طرح وہ بھی ظاہراً ایک بے پناہ تخلیقی قوت کا حامل ٹھہرتا ہے۔ اگر چہ اسکی یہ تخلیقی قوت و ایجاد خدا کی قدرت لایزال کے سامنے ہیچ ہے مگر ابلیس کے جو دیگر حریف موجودات ہیں ان کی بہ نسبت اسکی تخلیقی قوت بڑی چشمگیر ہے۔ ابلیس کی رو سے آدم جنت کی جامد وتخلیقی فضاؤں سے عاری دنیا میں محبوس تھے مگر اس نے آدم کے لیے ایسے حالات پیدا کیے کہ وہ دنیا کی تخلیقی وتولیدی سرگرمیوں میں اپنے بے نظیر خلاقانہ نقوش پیش کر سکے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود ابلیس دنیا میں اپنی تخلیقی جلوہ سامانیوں کے نئے سے نئے نمونوں کی تخریب کرکے ان سے عظیم تر اور نو بہ نو آثار کی نمائش میں مصروف عمل رہتا ہے۔ اقبال ابلیس کی ان تخلیقی باز آفرینیوں کی نقشہ کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ہے میری جرات سے مشت خاک میں ذوق نمو
میرے فتنے جامہ عقل و خرد کا تار و پو[۲۴]

(جبریل وابلیس)

ساختہ خویش را در شکنم ریز ریز
تاز غبار کہن پیکر نو آورم[۲۵]

(تسخیر فطرت ۔ انکار ابلیس)

(ترجمہ: ابلیس کہتا ہے کہ میں اپنی خلق کردہ اشیاء کو ریزہ ریزہ کرتا ہوں تا کہ اس کون و فساد کی دنیا میں نئی سے نئی صورتیں خلق کروں۔)

خودی کا وہ تیسرا پہلو جس کی بنا پر ابلیس اقبال کی نظر میں مورد توجہ ٹھہرتا ہے وہ ابلیس کی ذات کا فراق آمیز رخ ہے۔ فلسفہ خودی میں اپنی ذات کا اثبات و بقا کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ خودی وحدت الوجود کے فلفسیانہ ومتصوفانہ نظریہ حیات کے خلاف ایک فکری محاکمہ ہونے کے علاوہ اقبال کا ایک احتجاجی اقدام بھی ہے ۔کیونکہ وحدت الوجود نفس اور انسانی ذات کی اصالت وجود کا قائل نہیں ہے بلکہ وہ ذات ونفس کا کمال یہ مانتا ہے کہ وہ ذات مطلق میں فنا ہوجائے۔

نفس کا ذات مطلق کے ساتھ وصل جو ایک ذات یا شخصیت کے لیے سکون محض اور جمود کی کیفیت کے مترادف ہے ،تلاش وجستجو اور کوشش و تجسس کے خصائل کا جن سے حیات کی رونق ہے کی نفی محض ہوتی ہے۔ بالکل اس کے برعکس خودی اثبات ذات اور تعیین نفس کی خصوصیات پر مشتمل ہیں جو ذات یا شخصیت کی آبرو و کمال یہ جانتی ہے کہ ذات مطلق سے وصل و اتصال کے باوجود نفس اپنی خودی کو محفوظ رکھ کر اپنے بے انتہا کمال کے لیے جدوجہد اور جگر سوزی کو برابر جاری وساری رکھے۔ برخلاف اس کے اگر نفس یا ذاتِ انسانی ذات مطلق کے دریا میں فنا ہوجائے تو وہ اس اتصال کے نتیجے میں اپنی گرمی نفس اور تپش عشق سے جو سراسر ذوق عمل ونمود سے عبارت ہے محروم ہو کر بے حسی و بے حرکتی کا شکار ہو جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظر میں خودی کی بقاء کے لیے فراق کی کیفیت ناگزیر ہے کیونکہ فراق سے خودی کی گرمی اور تپش عشق کے ولولے قائم رہتے ہیں جبکہ وصل سے یہ تپش اور ولولے ماند پڑتے ہیں۔ بقول اقبال:

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ، ہجر میں لذتِ طلب
گرمی آرز و فراق شورش ہاے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق،قطرے کی آبرو فراق[۲۶]

(ذوق وشوق)

اے خوش آں جوے تنک مایہ کہ از ذوق خودی
در دل خاک فرو رفت وبدریا نرسید[۲۷]

(ترجمہ: اس جوے آب کا کیا کہنا جو ذوق خودی کی بدولت زمین کے اعماق میں چلی گئی مگر دریا میں پہنچ کر اپنے آپ کا خاتمہ نہ کیا۔)

ابلیس کی شخصیت میں فراق کا یہ پہلو اپنی ساری خصوصیات کے ساتھ موجود ہے ۔ اس نے ذات مطلق کے حکم سے سرپیچی کر کے آدمؑ کو سجدہ نہ کر کے خدا کی بارگاہ سے مطرود ہو کر فراق کے راستے کا انتخاب کیا۔ اگر چہ اس کے لیے یہ عین ممکن تھا کہ وہ ایک واقعی خالص توبہ کر کے

خدا کی بارگاہ سے مطرود ہونے سے بچ جاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس کے عین برخلاف اس نے ذات پروردگار کی بارگاہ سے فراق کی زندگی کو ترجیح دی جو اس کے لیے تخلیقی و عملی مقاصد اور تلاش و جستجو کی پرحرکت حیات کے لیے گونا گوں امکانات سے معمور تھی ۔ اقبال ابلیس کی اس المناک فراق آگیں شخصیت کا تذکرہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

گفت رومی خواجہ اہل فراق

آں سراپا سوز و آن خونیں ایاق

(ترجمہ: رومی نے مجھ سے کہا یہ یعنی ابلیس خواجہ اہل فراق ہے جو سراپا سوز اور خونین ایاق ہے۔)

فطرتش بیگانہ ذوق وصال

زھد او ترک جمال لایزال

(ترجمہ: اس کی فطرت ذوق وصال سے بیگانہ ہے خدا سے دور رہنا اس کی فطرت کا مقتضاء ہے اور اسکا زہد جلوہ ایزدی سے دور رہنے سے عبارت ہے۔)

تاگسستن از جمال آساں نبود

کار پیش افگند از ترک سجود[۲۸]

(نمو دار شدن خواجہ اہل فراق ابلیس)

(ترجمہ: اگرچہ جمال ایزدی سے دور رہنا ابلیس کے لیے بہت دشوار تھا مگر پھر بھی اس نے خدا کے حکم سے سرپیچی اختیار کی جس کے نتیجے میں وہ خدا کی بارگاہ سے دور ہوا۔)

اس طرح فراق کی راہ اختیار کر کے ابلیس نے قیامت تک ہستی میں حق و باطل کے گونا گوں معرکوں ،طرح طرح کے منصوبوں اور نت نئے تخلیقی حربوں کی راہ ہموار کی ۔حق و باطل کے ان معرکوں میں ابلیس باطل کے سردار و کمان دار کا بنیادی کردار ادا کر کے کائنات میں خیرو شر کی رستا خیز جنبش و جوش اور جست وخیز کا باعث بنتا ہے ۔اس کے مطابق دنیاو کائنات کی یہ جنبش و جوش ،اس جمود وسکوت سے افضل ہے جو وصل کا منطقی نتیجہ ٹھہر کر مرگ کے مترادف قرار پاتا ہے ۔ جمود وسکوت اور بے ارادی کی زندگی پر ابلیس پیکار سے مملو زندگی کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ

جہاں اپنی دنیا اپنے ارادے سے خلق کی جائے وہاں مصنوعی اور ایجاد و ابداع سے عاری دنیاؤں کی کوئی اہمیت نہیں۔جان ملٹن نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''فردوس گم گشتہ''(Paradise Lost) میں اس واقعیت کا نقشہ ابلیس کی زبانی بڑے موثر انداز میں کھینچا ہے کہ کس طرح ابلیس جنت کی بے ابداع زندگی کو الوداع کہہ کر نکل جاتا ہے:

> Farewell happy fields where joy ever dwells; hail horrors hail infernal world, and thou profoundest hell receive thy new possessor. One who brings a mind not to be changed by place or time the mind is its own place,and in itself can make Heaven of Hell, a Hell of heaven. what matter where if i be still the same, and what i should be, all but less than hee whom thunder hath made greater? Here at least we shall be free; the Almighty hath not built here for his envy, will not drive us hence: here we may reign secure,and in my choice to reign is worth ambition though in hell, better to reign in hell than serve in Heaven.[۲۹]

ابلیس ابداع و ایجاد کی زندگی کو جو اسے انکار وتمرد اور سرکشی کے طفیل نصیب ہوئی کسی بھی صورت میں ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔کیونکہ فراق میں وہ اپنی خودی کے سبھی امکانات کو عملی صورت میں بروئے کار لاکر شیطنت پر مبنی ابداع و ایجاد کی نئ سے نئ دنیا وَں کو معرض وجود میں لاتا ہے ۔ ابلیس عالم ہستی کو تعمیر وتخریب کی جولانی فراہم کرنے کا ایک باعث ہے اور اقبال کی نظر میں اسی حقیقت کے پیش نظر وہ فراق کی حرکی زندگی کو وصل کی سکونی زندگی کے بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا۔ بقول اقبال:

گفتمش بگذر ز آئین فراق

''ابغض الاشیاء عندی الطلاق''

(ترجمہ: اقبال کہتا ہے میں نے اس سے کہا تو فراق یعنی نافرمانی سے کیوں باز نہیں آتا اور

کب تک تو خدا سے دوری اختیار کرے گا۔ جدائی یعنی طلاق تو خدا کی نظر میں سب سے
منفور چیز ہے۔)

گفت ساز زندگی سوز فراق
اے خوشا سر مستی روزِ فراق[30]

(نمودار شدن خواجہ اہل فراق ابلیس)

(ترجمہ: ابلیس نے مجھ سے کہا زندگی کا ساز تو سوز فراق پہ منحصر ہے اگر میں فراق کو چھوڑ
دوں تو میری زندگی (تخلیقی زندگی) کا خاتمہ ہوگا۔فراق کے دنوں کی سرمستی کا کیا کہنا۔)

بال جبریل کی نظم ''جبریل و ابلیس'' میں مندرجہ بالا مضمون اقبال ابلیس کے حوالے سے
دوسرے الفاظ میں اس طرح ادا کرتے ہیں:

جبریل

ہر گھڑی افلاک پہ رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو

ابلیس

جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اس کے حق میں ''تقنطو'' اچھا ہے یالا تقنطو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو!
خضر بھی بے دست و پا ، الیاس بھی بے دست وپا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو[31]

اقبال ابلیس کے شیطنت پر مبنی فراق کو جو خودی کے عناصر ترکیبی میں سے ایک ہے اور
جس کا بنیادی مقصد حفظ و بقائے ذات ہے؛ایک علامتی و استعاراتی انداز میں بروئے کار لاکر

دراصل بنی نوع انسان کو اس کے ذریعے حفظ و بقائے ذات کا درس دیتے ہیں تا کہ انسانی خودی ایک رحمانی صورت میں نہ کہ شیطا نی قالب میں ابداع و ایجاد کی نئ سے نئ کائناتوں اور زندگیوں کا سراغ پا سکے۔

جہاں تک بے خودی کا تعلق ہے تو ابلیس بے خودی کے خاص عناصر ترکیبی میں سے ایک اہم عنصر یعنی نبوت و رسالت کے بڑے سخت حریف کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس سے پیشتر کہ فلسفہ بے خودی او ر ابلیس کے حوالے سے بات کی جائے اس نکتے کی جانب اشارہ کرتے چلیں کہ ابلیس کی انتہائی پیچیدہ ، فعال ومتحرک شخصیت میں جو متاثر کنندہ صفات پائی جاتی ہیں جو زندگی اور اس کی ارتقائی تکمیل کے لیے ممد و معاون ہونے کے ساتھ ساتھ خودی کے عناصر ترکیبی کو تشکیل دیتے ہیں ان متاثر کنندہ صفات اور خودی کے درمیان ایک گہرے معنوی ربط کا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔اسی معنوی ربط کی بنا پر اقبال کے یہاں فلسفہ خودی کو مد نظر رکھ کر ابلیس کے حوالے سے ایک ستائشی پہلو ملتا ہے ورنہ ابلیس کی شخصیت اور اسکی خودی ایک سلبی پہلو کی حامل ہے جو حق و باطل کے معیار کے پیش نظر نہ کسی ستائش کی حامل او رنہ قابل تقلید ہوسکتی ہے۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم:

> ابلیس کی خودی ایک سلبی خودی ہے ۔ اس میں ایجابی پہلو کا فقدان ہے ابلیس کے تصور میں بھی ایسے صفات موجود ہیں جو قلب ماہیت سے خودی کی تکمیل میں معاون ہوسکتے ہیں۔ اور ابلیس کی ستائش گری انہی صفات کہ وجہ سے ہے جن میں زندگی کا ارتقاء مضمر ہے اور ان صفات کے فقدان سے زندگی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ [۳۲]

تحرک وعمل ،تخلیق وتولید مقاصد اور فراق خودی کے مثبت نکات ہیں جنکا سراغ ابلیس کی شخصیت میں ملتا ہے مگر اسی مثبت پہلو کے ساتھ اسکی شخصیت میں ایک بڑا منفی پہلونفی نبوت و رسالت کا ہے جو بے خودی کی تشکیل میں اساسی نوعیت کا حامل ہے ۔ بے خودی خودی کے سکے کا

دوسرا رخ ہے اور اس رخ کی تابانی عقیدہ نبوت و رسالت سے ہے۔ اقبال کی نظر میں نبوت و رسالت جو نیابت الٰہی کا عظیم منصب ہے ملت اسلامیہ کے نظام حیات کی روح اور اس کے ارتقاء و تکامل کا ضامن ہے ۔ بلکہ یہ نظام حیات پوری نوع انسانی کے کلی ارتقاء و تکامل کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے۔ رسالت پر مشتمل نظام حیات کو تشکیل دینے کے لیے افراد اپنی خودی کے مرحلے سے وقتی طور پر گزر کر بے خودی کے دورانیے میں آتے ہیں اور بے خودی کے مرحلے میں اپنی مجموعی خودی یعنی رسالت کے نظام حیات کی جو نیابت الٰہی کا فیضان ہوتا ہے اجتماعی سطح پر تشکیل کرتے ہیں ۔ابلیس ابتدا سے ہی آدم کے اس نیابت الٰہی کے منصب کا سخت دشمن و مخالف رہا ہے بلکہ اسے وہ اپنی گمراہی اور سرکشی کا بنیادی باعث قرار دیتا ہے۔ نیابت الٰہی اور اس پر مشتمل رسالت ابلیس کے شیطنت آمیز منصوبوں اور آرزوؤں کی تکمیل میں ایک بنیادی رکاوٹ متصور ہوتی ہے ۔ اس کے یہ منصوبے و آرزوئیں ہر طرح کے فسادو فحشا،ظلم وستم اور ہلاکت و تباہی غرض ہر طرح کے شرو بدی پر مشتمل ہیں ۔ اس کے برعکس نظام رسالت یعنی نظام الٰہی ہر طرح کے خیر و صفا کا آئینہ ہے جو ابلیسی نظام حیات کی عین ضد ہے ۔ چناں چہ اس حقیقت کے پیش نظر ابلیس رسالت اور اس پر مشتمل نظام حیات کے ساتھ آدم کے منصب نیابت پر فائز ہونے کے پہلے دن سے ہی بر سر پیکار ہے۔ کیونکہ وہ اس نظام حیات کو اپنے مقاصد و اہداف کی شکست و ریخت کا اصلی عامل مانتا ہے اس لیے وہ اس کی نابودی کو اپنے مقاصد کی بر آری کی خاطر لازمی جانتا ہے ۔ اقبال نے اس حقیقت کی نقشہ کشی جاوید نامہ میں'' آزمائش کردن اہرمن زرتشت را'' کے نام سے موجود نظم میں بڑے موثر انداز میں کی ہے۔ اہرمن زرتشت سے کہہ رہا ہے:

از تو مخلوقات من نالاں چوں نے

از تو مارا فروردیں مانند دیے

(ترجمہ: اے زرتشت تیری نبوی تعلیمات سے میری مخلوقات یعنی ابلیس کے کارندے بہت نالاں ہیں اور تیری وجہ سے میری کامیابیوں کی بہار خزاں میں تبدیل ہوئی ہے۔)

در جہاں خوار و زبونم کردہ

نقش خود رنگیں زخونم کردہ

(ترجمہ: اے زرتشت تو نے مجھے دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا ہے اور میرے خون سے اپنے مقاصد و اہداف کو عملی جامہ پہنایا ہے۔)

زندہ حق از جلوہ سینائے تست
مرگِ من اندر ید بیضائے تست

(ترجمہ: حق تیرے ہی جلوہ سینا یعنی وحی رسالت سے دنیا میں زندہ ہے اور میری موت تیرے ید بیضاء یعنی الٰہی تعلیمات سے حتمی ہے۔)

شہر را بگذار و در غارے نشیں
ہم بہ خیل نوریاں صحبت گزیں

(ترجمہ: شہر کو چھوڑ دو (یعنی اجتماعی زندگی اور رسالت کو) اور کسی غار میں پناہ لے لو اور اس کے ساتھ ہی اہل دل یعنی قدسیوں کے ساتھ صحبت اختیار کر۔)

لیکن از پیغمبری باید گزشت
از چنین ملا گری باید گزشت[۳۳]

(ترجمہ: مگر پیغمبری اور رسالت کے کارِ عظمیٰ سے تم دست بردار ہو جاؤ۔ بھلا اس طرح کے ملا گری والے منصب سے تجھے کیا سروکار ہے۔)

ابلیس اس طرح فلسفۂ بے خودی کے تشکیلی رکن یعنی رسالت سے اپنا منہ موڑ کر دنیا میں اس کی بیخکنی کے لیے کمر بستہ ہو جاتا ہے اور یوں رسالت سے مقابلے کے لیے اپنے متنوع حربوں، منصوبوں اور مختلف مظاہر کو میدان کارزار میں جھونکتا ہے اور نتیجتاً حق و باطل کے درمیان ایک عظیم رستاخیز کی بنا رکھتا ہے:

غرق اندر رزم خیرو شر ہنوز
صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز[۳۴]

(نمودار شدن خواجہ اہل فراق ابلیس)

(ترجمہ: یہ ابلیس خیر و شر کے معرکے میں ابھی بھی جٹا ہوا ہے اس نے سب پیمبروں کو دیکھا مگر کسی پر بھی ایمان نہ لایا اور آخر کار کافر ہی رہا۔)

حوالہ جات

۱۔ فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر،جلد۲، اسلامک بک فاونڈیشن ، نئ دہلی، ۱۹۹۲ء، ص،۳۰۰۔

۲۔ ایضاً،ص،۳۰۸۔

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ، اقبال سب کے لیے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص،۶۸۔۶۹۔

۴۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان ، سنہ ندارد،ص ،۱۲۔

۵۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور، اقبال کی مابعد الطبیعیات، گلشن پبلشرز گاوکدل چوک سرینگر کشمیر،۹۲۔۱۹۹۱ء، ص،۶۹۔۷۰۔

۶۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،عشرت علی ناصری برائے اسلامک بک سنٹر، دہلی،۱۹۹۲ء،ص،۲۰۸۔

۷۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان ، سنہ ندارد،ص ،۴۱۔

۸۔ ایضاً،ص،۴۲،۴۳۔

۹۔ ایضاً،ص،۴۴۔

۱۰۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم،فکر اقبال، دارالاشاعت مصطفائی، دہلی،۲۰۱۴ء،ص،۳۰۲۔

۱۱۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، اقبال سب کے لیے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی،۲۰۱۴ء،ص،۸۵۔۸۶۔

۱۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم،فکر اقبال، دارالاشاعت مصطفائی، دہلی،۲۰۱۴ء،ص،۴۶۴۔

۱۳۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان ، سنہ ندارد،ص ،۸۵۔

۱۴۔ ایضاً،ص،۹۲۔

۱۵۔ ایضاً،ص،۹۵۔

۱۶۔ ایضاً،ص،۱۰۱۔

۱۷۔ علامہ اقبال، کلیات مکاتیب اقبال ، جلد۲، مرتبہ مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص، ۲۳۶۔

۱۸۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، افکار اقبال (تشریحات جاوید) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص،۳۴۷۔

۱۹۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان ، سنہ ندارد، ص ،۴۹۔

۲۰۔ ایضاً، ص،۲۵۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص،۲۴۷۔

۲۲۔ ایضاً، ص،۲۵۵۔۲۵۶۔

۲۳۔ ایضاً، ص،۱۶۔۱۷۔

۲۴۔ کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص،۵۹۹۔

۲۵۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان ، سنہ ندارد، ص ،۲۵۶۔

۲۶۔ کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص،۵۶۵۔

۲۷۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان ، سنہ ندارد، ص ،۴۸۲۔

۲۸۔ ایضاً، ص،۲۲۷۔۲۳۷۔

۲۹۔ Jhon Milton,Paradise Lost,Orient Blackswan Private limted, Hyderabad India, 2011, p9-10.

۳۰۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان ، سنہ ندارد، ص ،۲۴۷۔

۳۱۔ کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص،۵۹۸۔۵۹۹۔

۳۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، دارالاشاعت مصطفائی، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص،۴۶۳۔

۳۳۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان ، سنہ ندارد، ص ،۶۳۶۔۶۳۷۔

۳۴۔ ایضاً، ص،۲۳۷۔

باب سوم

علامہ اقبال کے فکروفن کے لحاظ سے دنیا میں ابلیس کے مختلف مظاہر

کسی برجستہ شے کی معنوی جہات ہر زماں و مکان میں اپنے معنویاتی رسوخ و بلوغ کی بنا پر کسی نہ کسی ہیئت اور کسی نہ کسی انداز میں اپنی موجودگی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔ یہ جہتیں زماں و مکاں کے تغیر کے ساتھ بے معنی ہو کے نہیں رہتی ہیں بلکہ یہ نئے سے نئے معنی کی باز یافت میں سرگرم عمل رہتی ہیں۔ ابلیس حق و باطل کی معرکہ آرائی میں انسان کو شکست و ریخت اور تنزل و انحطاط سے دو چار کرنے کی خاطر دنیا میں اپنے سبھی ممکنہ مظاہر و امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور یہ مظاہر و امکانات ہی دراصل اس کی شخصیت کی معنوی جہات کا تعین کرتے ہیں۔ ان مظاہر کی معنوی اہمیت و حیثیت کو مد نظر رکھ کر ابلیس کے پیش نظر اس معرکہ آرائی میں جو بنیادی ہدف و مقصد ہے وہ انسان کو منصب نیابت و رسالت الٰہی ، کرامت و رفعت انسانی سے محروم کر کے اسے دنیوی ذلت و نکبت کے ساتھ دائمی و ابدی یاس حرماں سے دو چار کرانا ہے۔ ابلیس و آدم کی اس باہمی رستا خیز و رسا کشی میں جو انسان یا انسانی معاشرے کامیاب و کامران ہوتے ہیں وہی اصل میں ارتقا و جاودانگی پا کر نیابت الٰہی سے ہمکنار ہو کے تسخیر و تصرف ذات کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ابلیس انسان کے تکامل وارتقاء کے لئے ایک کڑی آزمائش کی حیثیت رکھتا ہے جس سے وہی افراد و معاشرے صحیح و سالم نکلتے ہیں جو اپنی سیرت و اعمال کے لحاظ سے اصلح و پختہ سے پختہ تر ہوتے ہیں اور جو افراد و معاشرے ہزیمت سے دو چار ہوتے ہیں ان کی یہ ہزیمت ان کے مجموعی کردار کے اضمحلال پر دلیل موجہ ہوتی ہے۔ ابلیس کے ایک ذریعہ آزمائش ہونے کی عالمی ادبیات میں بہترین ترجمانی مولانا روم نے مثنوی میں موجود نظم ''ابلیس اور معاویہ'' کے عنوان سے کی ہے۔ اقبال کے یہاں جو ابلیس کے کردار ، شخصیت اور اعمال و افعال کے متعلق ایک اعتذار آمیز لب و لہجہ نظر آتا ہے وہ دراصل انہوں نے رومی سے ہی اخذ کیا ہے:

گفت ابلیس گشای این عقدرا
من محکم قلب را و نقد را

(ترجمہ: ابلیس نے معاویہ سے کہا میں تم پر اس عقدے کو کھولتا ہوں کیونکہ میں کھرے اور کھوٹے کی کسوٹی ہوں۔)

امتحان شیر و کلبم کرد حق
امتحان نقد و قلبم کرد حق

(ترجمہ: خدا نے مجھے اس لیے تخلیق کیا کہ شیر اور کتے میں تمیز ہو جائے۔)

قلب رامن کی سیہ رو کردہ ام
صیرفی ام، قیمت او کردہ ام

(ترجمہ: دل یعنی انسان کو میں کب روسیاہ کرتا ہوں جب وہ سودا کرتے ہیں ۔ میں صراف ہوں اور جس کی جیسی قیمت ہوتی ہے ادا کرتا ہوں۔)

نیکوان را راہنمائی می کنم
شاخھای خشک را برمی کنم

(ترجمہ: میں نیک لوگوں کی راہنمائی کرتا ہوں، البتہ خشک شاخوں کو کاٹنا میرا وظیفہ ہے۔)

نیک را چوں بد کنم یزدان نیم
داعیم من خالق ایشان نیم

(ترجمہ: میں کسی نیک کو بد نہیں بنا سکتا ہوں یہ کام تو خالق حقیقی کا ہے میرا کام بس برائی کی طرف دعوت دینا ہے، نہ کہ میں مخلوقات کا خالق ہوں۔)

خوب رامن ز شت سازم رب نہ ام
ز شت راو خوب را آئینہ ام[1]

(ترجمہ: اچھے کو میں برا نہیں بنا سکتا کیونکہ میں رب نہیں ہوں بس میں فقط ایک ایسا آئینہ ہوں جس میں نیک اور بد اپنی اپنی صورتیں دیکھ سکتے ہیں۔)

ابلیس اسی اعتذار آمیز مکروفریب کے ہمراہ دنیا کے وسیع و عریض کا رو بار زیست میں صدہا رنگوں وصورتوں میں انسان سے اپنے دیرینہ حسد وحقد کی بنا پر اپنے لاولشکر کے سمیت اس کے خلاف برسرپیکار ہے۔ اس کا یہ لا ولشکر کرہ خاکی پر اپنی کمیت و کیفیت کے حوالے سے بڑا عظیم ہے جو اس نے اپنی فعلیت وتخلیقیت کے توسط سے معرض و جود میں لایا ہے۔ بقول اقبال:

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دوصد ہزار ابلیس[۲]

(سیاست افرنگ)

اقبال کے فکروفن میں ان دوصد ہزار ابلیسوں میں سے جو پیچیدہ و چیدہ چیدہ ابلیسی مظاہر نمایاں انداز میں دنیا میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں کچھ اس طرح سے ہیں؛حسی عقلیت پرستی ،نژاد پرستی، وطنیت مبنی بر عصبیت ، ملوکیت ، سرمایہ داری ، اشتراکیت ،سکیولرازم ، مادہ پرست مغربی تہذیب ، استعمار، تقدیر پرستی ، رہبانی تصوف اورکلامی مناقشات۔ اقبال کے فکر وفن میں ان ابلیسی مظاہر کا معنوی طور پر بڑے برجستہ اور بر ملا انداز میں اظہار ہوا ہے۔

جہاں تک حسی عقل پرستی کا تعلق ہے تو وہ ''عقل'' سے ایک بالکل مختلف شئے ہے ۔ عقل اور وظیفہ عقل کے اقبال بڑے معترف و حامی ہیں اس کے برعکس حسی عقلیت پرستی کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اسے ابلیسی مظاہر میں سے ایک قرار دیتے ہیں۔ اسلامی معارف میں عقل اور وظیفہ عقل کی کافی تعریف وتمجید کی گئی ہے۔ان معارف میں عقل کو پروردگار عالم کی پہلی مخلوق قرار دیا گیا ہے جو عالم انسانیت و عالم بہیمیت کے درمیان ایک حد فاصل ٹھہرتی ہے۔ چناں چہ قرآن حکیم میں بہت سی آیات مبارکہ عقل اور عقلی تفاعل کی تائید ،توثیق و ترغیب کے حوالے سے موجود ہیں۔ ارشاد باری ہے:

و سخر لکم الیل وَالنهار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بأمره ان فی ذالک لایٰت لقوم یعقلون. [۳]

(ترجمہ: اس نے تمہاری خاطر رات اور دن کو اور سورج اور چاند کومسخر کر رکھا ہے او رسب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جوعقل سے کام لیتے ہیں۔)

اور نبی کریمؐ کا عقل کے متعلق ارشاد گرامی ہے:

اول ماخلق اللّٰہ العقل [۴]

(ترجمہ:اللہ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا۔)

ان تعلیمات کی روشنی میں یہ نکتہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی معارف و ثقافت میں عقل اور عقلی حقائق کی کتنی اہمیت تسلیم کی گئی ہیں ۔ اسلام میں عقل کا ایک معین و مشخص وظیفہ عمل مقرر ہے جس کے حدود و قیود کا دائرہ بھی متعین ہے۔عالم محسوسات میں عقل انسان کے لیے اپنے حدود و قیود کو مدنظر رکھ کر ایک چراغ راہ کا کام دیتی ہے۔ اس چراغ کی روشنی میں انسان عالم طبیعت کا شعور ، عالم فطرت کے حقائق اور بالخصوص اپنی ذات کا ایک معین حد تک ادراک حاصل کر لیتا ہے ۔ اسی حقیقت کی روشنی میں اسلامی حکماء و فلاسفہ عقل کو فیض مطلق یعنی خداوند تعالیٰ کے نور کا سب سے پہلا ظہور اور مرحلہ تسلیم کرتے ہیں ۔ اس نور کی روشنی میں انسان کو حقیقت اشیاء معلوم ہوتی ہے جب انسان کو اشیاء کی حقیقت معلوم ہوتی ہے تو انہیں مسخر کرنے اور اپنے دست تصرف میں لانے کی راہ اس کے لیے باز ہوجاتی ہے جس سے عقلی فتوحات کا ایک عظیم سلسلہ معرض وجود میں آتا ہیں۔ اشیاء کی حقیقت امر معلوم ہونے کے متعلق اسلام کی علمی و عقلی ثقافت میں جو ایک روشن روایت ملتی ہے اقبال اس حوالے سے کہتے ہیں:

> اسلام میں عقلی بنیادوں کا سلسلہ رسول کریمؐ کی ذات با برکات سے شروع ہوتا ہے وہ ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے تھے،"اللّٰھم ارنی حقائق الاشیاء کما ھی"(اے اللہ تو مجھے چیزوں کی اصلیت سے آگاہ کر۔)[۵]

اشیاء کی یہ حقیقت و اصلیت عقل پر اس سے ماوراء ایک چیز یعنی وحی و الہام کی روشنی میں ہویدا ہوتی ہے ۔ وحی کے بغیر عقل ماوراطبیعی و ماوراء حاسہ حقائق و اشیاء کے ایک نا قابل تصور و نا قابل احصاء عظیم سلسلے کا ادراک نہیں کرسکتی ہے۔ جب عقل وحی کی روشنی و رہنمائی میں عالم محسوسات کے حقائق کے ساتھ ساتھ محسوسات سے ماورا یعنی ماوراء طبیعی دنیا کے اسرار و رموز کا عرفان حاصل کرتی ہے تب اقبال کے نقطۂ نگاہ سے عقل دانش برہانی سے دانش نورانی بن جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں برہانی عقل اپنی محسوساتی اور طبیعی نارسائیوں سے چھٹکارا پا کر اس عالم مادی میں حیرت و سرگردانی سے نجات پاتی ہے:

اک دانش نورانی اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی[6]

دانش برہانی یا حسی عقلیت پرستی (Empiricism) کی اساس محض محسوساتی مدرکات و مشاہدات پر استوار ہے۔ اس کے نزدیک ان اشیاء وحقائق کا کوئی وجود نہیں ہے جو انسانی محسوسات و مشاہدات کی قلمرو و احاطے سے خارج ہے ۔ یہاں پر پہلے حسی عقلیت کی تعریف کو ملاحظہ کرتے ہیں بعد میں اس کے دیگر امور کی جانب متوجہ ہوتے ہیں ۔آکسفورڈ ڈکشنری آف فلاسفی میں حسی عقلیت و تجربہ گرائی کی یوں تعریف کی گئی ہے:

Empiricism the permanent strand in philosophy that attempts to tie knowledge to experience . Experience is thought of either as the sensory content of conciousness, or as what ever is expressed in some designated class of statements that can be observed to be true by the use of the senses. Empiricism denies that there is any knowledge outside this class, or atleast outside whatever is given by legitimate theorizing on the basis of this class. It may take the form of denying that there is any a priori knowledge, or knowledge of necessary truths, or any innate or intuitive knowledge or general principles gaining credibility simply through the use of reason.[7]

اس تعریف سے یہ حقیقت صاف لفظوں میں ظاہر ہوتی ہے کہ حسی عقل پرستی و تجربہ گرائی مافوق الحس حقائق سے کلی طور پر انکارکرتی ہے اور ان حقائق و اشیاء کو مسترد کرتے ہوئے انہیں موہوم و غیر واقعی ٹھہراتی ہے۔ جیسا کہ یہ معلوم ہے کہ ذات باری ،وحی،ملائکہ، رسالت و معاد وغیرہ جیسے مذہبی مسلمات کی بنیاد ماوراءطبیعی حقائق پر استوار ہیں اس لیے حسی عقل پرستی کو مدنظر رکھ کر یہ سب اعتقادات منطقی طور پر پوری طرح مسترد ہوتے ہیں اور مجموعی طور پر ان کا وجود باطل ٹھہرتا ہیں۔ مزید برآں اس طرح سارے مذہبی و اعتقادی نظام کی بنیادیں متزلزل ہوکر

مذہب ایک لایعنی(Absurd) شے میں تبدیل ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ واقعاً تعقل پرستی اپنی ماہیت اورحسی و تجربی بنیاد پر ایسے رسوخ و وثاقت کی حامل ہے کہ وہ جس چیز یا شے کے وجود سے انکار کریں وہ حقیقت میں کالعدم اور ناقابل ثبوت بنتی ہے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹرعشرت حسن انور:

تعقلات تو ہمارے روز مرہ تجربات کے بھی پورے طور پر آئینہ دار نہیں ہوتے... جوعلم تعقلات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ صرف اضافات اور مشابہات پرمشتمل ہوتا ہے، شے بذاتہ یا شے کما ہی کا نہیں ہوتا۔ [۸]

تعقلات یعنی فلسفہ حسی مذہبی مسلمات کو شک وشبہہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان مسلمات کو وہ حسی یا تجربی بنیادوں پرآزماتا ہے تاکہ ان کی حقیقت وصداقت ثابت ہوسکے۔مگر خود محدود اور مادی ماہیت کا حامل ہوکے فلسفہ حسی ایک غیرمحدود اور غیر مادی شے جیسے وجود باری اور دیگر مذہبی عقائد کی صداقت و اصالت کو ثابت کرنے اور اس صداقت پرحکم لگانے کے لیے فی نفسہ اہلیت کا حامل نہیں ہے۔ چہ جائیکہ عقل حسی مذہبی و اعتقادی امور کے محاکے کے حوالے سے اپنی نارسائیوں کا اعتراف کرتی اس نے ساری مذہبی بدیہیات کوسرے سے ہی عبث قرار دیا۔ اس حسی و مادی عقلیت کے بانیوں جیسے فویرباخ، لاک اور رسل وغیرہ کا جو بنیادی نظریہ ہے وہ بقول شہید مطہری اس کلام پرختم ہوتا ہے کہ:

مذهب مبنای منطقی ندارد[۹]

(ترجمہ: مذہب کی کوئی منطقی بنیادنہیں ہے۔)

اس منطق کے مطابق جہان ہستی کا کوئی خالق و صانع نہیں ہے بلکہ یہ ساری ہستی خود بخود عناصر کے غیرشعوری امتزاج اور ترکیب وتحلیل سے وجود میں آگئی اور عناصر کا یہی غیرشعوری نظم وترتیب اس جہان ہستی کوسنبھالے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ جہان ہستی کی خلقت ایک حادثے کی صورت میں عمل میں آئی جس کا کوئی مشخص ہدف ومقصد نہیں ہے اور نہ ہی کوئی منطقی انجام ،یوں مجموعی طور پر یہ ساری کائنات عبث ہے۔قرآن حکیم اس فکر کو دہریت سے

معنون کرتا ہے اور اس فکر کے حامل افراد اسلامی تاریخ میں دہریوں کے نام سے جانے جاتے ہیں ۔جن کا عقیدہ تھا کہ زمانہ ہی اس کائنات کا حکیم ومدبر ہے۔قرآن مجید کا ارشاد گرامی ہے:

وقالو ماھی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا وما یھلکنا الا الدھر
ومالھم بذالک من علم ان ھم الا یظنون۔ [۱۰]

(ترجمہ: اور ان لوگوں نے کہا کہ ہماری زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے،کچھ لوگ ہم میں سے مرتے ہیں اور کچھ جیتے ہیں اور ہم کو بس زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے انہیں ان باتوں کاعلم بھی نہیں بلکہ بے بنیاد گمان ہی کرتے ہیں۔)

اس حسی و مادی عقلیت اور ان مادی افکار کی صدائے بازگشت اقبال کی معرکتہ الآراء نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے پہلے شعر سے ہی یوں سنائی دیتی ہے:

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنان عرش اعظم کی تمناؤں کا خوں [۱۱]

ابلیس کے بقول عالم ہستی اور یہ دنیا عناصر کے پرانے کھیل سے عبارت ہے۔اسکا دنیا کوعناصر کے پرانے کھیل سے معنون کرنا اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ ابلیس کی تعلیمات کی اساس اور ابلسیت کی تمام صورتوں کا قرار اس تصور پر ہے کہ یہ دنیا عناصر مادی کا بس ایک غیر شعوری امتزاج ہے یعنی مادہ ازل سے ہے اس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہاء اور سالمات کے باہمی ربط و انجذاب سے کائنات کی تخلیق عمل میں آئی ہے نہ اسکا کوئی خالق ہے اور نہ صانع بلکہ یہ ایک اندھی طاقت کا سب کرشمہ ہے ۔اقبال حسی و مادی عقلیت پرستی کی اس فکری وعقلی حیرانی اور انحراف و سرگردانی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں ۔جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے عہد میں مغربی دنیا میں عقل استدلالی وطبیعی کا دور دورہ تھا جس کے اثر سے مجموعی طور پر انسان دین سے برگشتہ ہوکر صرف خدا ہی نہیں بلکہ اپنے ضمیر و وجدان اور دیگر تمام مافوق حقائق کا منکر ہوگیا۔ یہ حقیقت اظہرمن الشّمس ہے کہ اقبال کے فکر ونظر میں دین اور دینی افکار وتعلیمات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اسی لیے وہ مادی عقلیت کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے دینی مسلمات

کے دفاع میں اپنا زورِ قلم صرف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

لا الہ سرمایہ اسرار ما
رشتہ اش شیرازہ افکار ما

(ترجمہ: لاالہ ہمارے اسرار کا سرمایہ ہیں اور لاالہ کا تانا بانا ہمارے افکار کا شیرازہ بند ہے۔)

ما مسلمانیم و اولاد خلیلؑ
از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل[۱۲]

(رموز بے خودی)

(ترجمہ: ہم مسلمان ہے اور ابراہیم خلیلؑ کی اولادوں میں سے ہیں اگر اس بات پر آپ کو دلیل چاہیے تو قرآن کی یہ آیت ملت ابیکم ابراہیم پڑھ جو ابراہیمؑ کو مسلمانوں کا باپ قرار دیتی ہیں۔)

اقبال ایسی حسی و مادی عقل پرستی کو جو وحی و الہام یا ماوراطبیعی فیوضات سے کنارہ کشی اختیار کرکے کلی طور پر دینی تعلیمات کی بیخکنی کرکے انسان کے لیے کسی برتر اخلاقی آئین کی پابندی کو سرے سے ناممکن بنا دیتی ہے مظہر ابلیس قرار دیتے ہیں۔ان کی نظر میں عقل اپنا فریضہ تب احسن طریقے سے انسان کے ارتقاء و تکامل کے حوالے سے انجام دے سکتی ہے جب وہ وحی و الہام کے سایے میں گامزن رہے مگر جب وہ دینی بدیہیات سے اپنا منہ موڑتی ہے تب وہ صرف ایک ابلیسی مظہر کے روپ میں دنیائے انسانیت اور انسانی اقدار کے ساتھ برسر پیکار رہتی ہے۔جو عقل دین کے تحت رہتی ہے اُسے اقبال عقل یزدانی اور جو دین سے بیزار رہتی اسے وہ عقل شیطانی کے نام سے معنون کرتے ہیں ۔عقل یزدانی کی تعمیری اور عقل شیطانی کی تخریبی کارگزاریوں کے ساتھ ساتھ ان کی تعریف و تفاوت کے حوالے سے اقبال کہتے ہیں:

نخست از فکر خویشم در تحیر
چہ چیز است آنکہ گویندش تفکر!

کدامین فکر مارا شرط راہ است

چرا گہ طاعت و گاہے گنہ است!

(ترجمہ: پہلے میں اپنی فکر یعنی عقل کے حوالے سے حیران ہوں کہ کیا چیز ہے وہ جسے ہم تفکر کہیں؟ وہ کونسی فکر ہے جو ہماری نجات کی ضامن ہے؟ کیوں کبھی یہ فکر یعنی عقل ثواب ٹھہرتی ہے تو کبھی گناہ بن جاتی ہے؟)

ز احوالش جہان ظلمت و نور

صدائے صورومرگ و جنت و حور

ازو ابلیس و آدم را نمودے

ازو ابلیس و آدم را کشودے

اگر یک چشم بر بندد گنا ہے است

اگر باہر دو بیند شرط راہے است[13]

(گلشن راز جدید)

(ترجمہ:عقل سے ہی دنیا تاریک یا پرنور رہتی ہے اورصورو مرگ و جنت وحور بھی عقل کے ممکنات سے ہیں ۔عقل سے ہی آدم اور ابلیس اپنی جلوہ نمائی کرتے ہیں اورعقل سے ہی دونوں کے میدان عمل کی گنجائش ہوتی ہے۔مگر اگرعقل نے بس اپنی ایک آنکھ یعنی حس وادراک پر ہی بنا رکھی اور دین سے روگرداں ہوئی تو تب عقل گمراہی کا باعث بن کر منفور ٹھہرتی ہے اور جب عقل اپنی توانائیوں کے ہمراہ وحی اور دین کی پرنور تعلیمات کے سائے میں گامزن ہوتی ہے تب وہ نجات کا ضامن بنتی ہے۔)

عقل اور دین کے درمیان جب انفکاک و انشقاق عمل میں آتا ہے تو عقل رحمانی صورت سے خارج ہوکر شیطانی صورت وعمل آوری کا رخ اختیار کرتی ہے:

عقل اندر حکم دل یزدانی است

چوں ز دل آزاد شد شیطانی است [14]

(پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)

(ترجمہ: عقل جب دین کے تحت ہوتی ہے تو وہ رحمانی ہوتی ہے جونہی وہ دین سے آزاد ہوتی ہے تو وہ شیطانی بنتی ہے۔)

حسی و مادی عقلیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ جو چیزیں نظر نہیں آتی ہیں یا جو مافوق الحواس چیزیں ہیں انکا سرے سے وجود ہی نہیں ہیں۔ایسا نظریہ خدا کی نفی ذات کے ساتھ ساتھ دیگر دینی امور کے انہدام و انحلال پر منتج ہوتا ہے ۔ اس انہدام و انحلال کے نتیجے میں انسانی معاشرہ دین اور اس کے مجموعی قوانین سے یکسر محروم ہوکر اخلاقی دیوالیہ پن ، اجتماعی خلفشار اور روحانی بحران کا شکار ہو کر تباہی و بربادی سے ہمکنار ہوتا ہے۔موجودہ دور کی انسانیت سوز اخلاقی و اعتقادی ناہنجاری اسی مادی عقلیت ،حس گرائی اور یک رخے تجربی سائنس کی دین ہے۔ تجربی سائنس اورحس گرائی کا دارومدار اور دائرہ کار محسوسات پر منحصر ہے اس لیے جن معاشروں میں تجربی سائنس اور اس سے وابستہ امور کو ایک بت سنگین کی عظمت حاصل ہے وہاں اس کے اثر سے دینی و مذہبی تمدن کے جو گوناگوں ابعاد ہوتے ہیں جیسے اعتقادی و اخلاقی، عائلی و اجتماعی، سیاسی و اقتصادی پوری طرح نیست و نابود ہوئے۔ جو معاشرے اس صورت حال سے بری طرح دو چار ہوئے وہ مغربی معاشرے ہیں چونکہ تجربی علوم کا دائرہ کار محسوسات تک محدود ہے اس وجہ سے اہل مغرب نے محض ان چیزوں کو قبول کیا جو محسوسات کے دائرے میں آتی تھیں اور جو امور اس دائرہ کار میں نہ آتے تھے وہ یکسر ان کے ایمان و ایقان سے خارج ہوکر مسترد کر دئے گے۔ علاوہ بریں انہوں نے تجربی سائنس کی روش کے سوا معرفت شناسی کے تمام راستوں اور روشوں کو یک لخت قلم زد کر دیا۔ بقول سید محمد قطب کے:

> بلاشبہ اس طرز عمل پر انھیں ان کی اس خالص مادہ پرستانہ طبیعت ہی نے ابھارا جو انھیں قدیم روما سے ورثے میں ملی تھی اور جو انھیں ابھی تک اسی ڈگر پر کھینچ رہی تھی ۔ اس لیے اہل مغرب تو وہی بات مانتے ہیں جس پر تجربے کی مہر لگی ہو، کیونکہ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔مگر جو بات تجربے کے خراد پر نہ چڑھ سکے وہ محض بکواس ہے یا کم از کم اس قابل نہیں ہے کہ اسے خاطر میں لا یا جائے۔ چونکہ ذات باری بھی

کسی تجربہ گاہ میں نہیں لے جائی جاسکتی اور نہ تجربی سائنس کے سامنے پیش کی جاسکتی ہے ، اس لیے اہل مغرب کو خدا کی بھی ضرورت نہیں رہی اور انھوں نے برملا کہہ دیا کہ ’’کوئی خدا نہیں ہے‘‘ ۔ [۱۵]

بقول اقبال :

تعلیم پیر فلسفہ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش [۱۶]

(مذہب)

حسی و مادی عقلیت پرستی کی کرشمہ سازیاں انکار ذات باری اور دیگر فکری واعتقادی اصول کی نفی تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس نے انسان کو اپنی شناخت ہی سے محروم کردیا۔انسان کی ماہیت دونا قابل انشقاق ابعاد پر مشتمل ہیں جن میں ایک روحانی بعد ہے اور دوسرا مادی۔ جب حس گرائی کے تہاجم سے انسان معرفت کے روحانی والٰہی ذرائع سے کٹ گیا تو نتیجتاً وہ اپنی روحانی شناخت کے ذرائع اور منابع سے محروم ہوگیا۔ اس محرومی نے بالآخر انسان کی زندگی کو لامقصدی و لایعنی بنا دیا۔ لایعنیت نے انسان کو کسی بھی برتر اخلاقی وقانونی مسئولیت پزیری اور کسی اعلٰی ہدف ومقصد سے بیگانہ کر دیا۔ انسان صرف اپنے ماحول اور اپنے خود ساختہ قانونی امورو اعتبارات کے خول میں گرفتار ہوکر رہ گیا اور یہ گرفتاری انسان کے روشن مستقبل کو تاریک سے تاریک تر بناتی گئی۔ وہ زمانے کی ایسی تاریک و بندگلی میں پھنس گیا جہاں اگلے کنارے پر مستقبل کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ یہ سب المیہ اس مفروضے کی دین ہے کہ انسانی حواس سے مافوق علم و ہدایت کا کوئی منبع موجود نہیں ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ انسانیت کی مجموعی فلاح و بہبود کے لیے عقل کو معرفت کے وحیانی ذرائع کی روشنی میں اپنی کارکردگی انجام دینی چاہیے۔تبھی عقل انسانیت کے لیے ایک چراغ راہ ثابت ہوگی ورنہ اس کے بغیر وہ حسی و مادی

عقل پرستی کا ابلیسی رخ اختیار کر کے انسانیت کی تباہی کا سامان بن جائے گی۔

حسی عقل پرستی کے بعد ابلیس کے اور ایک مظہر یعنی نژاد پرستی کی جانب آتے ہیں جس کی ابتداء ابلیس کے ہی ہاتھوں ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کہ بحث کو آگے بڑھائے نژاد پرستی کی تعریف ملاحظ کرتے ہیں:

> Racism the inability or refusal to recognize the rights, needs, dignity, or value of people of particular races or geographical origins. More widely, the devaluation of various traits of character or intelligence as typical of particular people.[۱۷]

یہ بات تعریف سے صاف طور پر مترشح ہوتی ہے کہ نژاد پرستی کا لب لباب یہ ہے کہ اپنی ذات یا شخصیت کو دوسروں سے برتر و اعلیٰ قرار دیا جائے۔ یہ برتری بنیادی طور پر رنگ یا نسل، علاقائی و جغرافیائی امتیازات پر قائم کی جاتی ہے۔ نژاد پرستی کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شے یا وجود کے مدمقابل نسلی برتری قائم کی جاتی ہے اس شے یا وجود کی خلقی و تخلیقی اعتبار سے تحقیر لازم آتی ہے۔ اس طرح تحقیر شدہ شے یا وجود کو تخلیقی اعتبار سے اپنے سے ادنیٰ و فرومایہ قرار دیے کر اس پر اپنی بالادستی و فوقیت مسلط کرنے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ نسل پرستی اعلیٰ و ادنیٰ ذات و نژاد کا تصور قائم کر کے ادنیٰ نژاد کو فطری اعتبار سے اپنی بہ نسبت کم مایہ، نااہل و بے خاصیت، بے اوصاف و بے شرف ٹھہراتی ہے اور اس کے برعکس اعلیٰ نژاد کو لائق و فائق، اوصاف حمیدہ کا حامل اور شرف و شہامت سے متصف قرار دیتی ہے۔ یہ امتیاز و تبعیض وہ کسی فطری صلاحیت و استحقاق کے بغیر ہی اپنے لیے مقرر کرتی ہے۔ نژاد پرستی کے ان سبھی مذکورہ اوصاف و کوائف کو مدنظر رکھ کر اس ہستی کا جو سب سے بڑا نژاد و نسل پرست قرار پاتا ہے وہ ابلیس کی ذات ہے۔ کیونکہ جب خدا ملائکہ اور ابلیس کو حکم دیتا ہے کہ آدم کو سجدہ کرو تو فقط ابلیس سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے اور سجدہ نہ کرنے کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ میری خلقت آگ سے عمل میں آئی ہے اور

آدم مٹی سے خلق ہوے ہیں؛ آگ مٹی سے افضل ہے اس لیے میں آدم کو سجدہ نہیں کر سکتا ہوں۔ اقبال ابلیس کے اس نسلی غرور و تفاخر کی کس خوبی کے ساتھ ترجمانی کرتے ہیں:

نوری ناداں نیم بآدم سجدہ برم
او بہ نہا داست خاک من بہ نژاد آزرم

(ترجمہ: میں نوری ہوں یعنی آگ سے خلق ہوا ہوں، ناداں نہیں ہوں کہ آدم کو سجدہ کروں کیونکہ وہ مٹی کا پتلا ہے جبکہ میں آتش نژاد ہوں۔)

آدم خاکی نہاد دوں نظر و کم سواد
زاد درآغوش تو پیر شود دربرم [۱۸]

(انکار ابلیس)

(ترجمہ: مٹی کا یہ پتلا آدم فرو مایہ اور جاہل ہے یہ آپ کی آغوش میں (خدا کی) پیدا ہوتا ہے مگر بوڑھا میری گود میں ہوتا ہے۔)

ابلیس نے حسد وتکبر کی بنا پر آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کیا اور یوں نژاد و نسل پرستی کی بنا ڈالی۔ خدا نے آدم کو اپنی روح سے آراستہ کر کے اشرف المخلوقات کا لقب عطا کر کے زمین پر اپنا خلیفہ نامزد کیا۔ ابلیس نے حسد اور بغض و عناد کی بنا پر اسے جاہل و کم سواد بے شعور و نا لائق کے القاب سے معنون کر کے اس پر اپنی نسلی برتری کی دھونس قائم کر کے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے انکار کی علت یہ نہیں تھی کہ وہ عبادت و ریاضت اور دیگر نیک اعمال کے حوالے سے آدم سے برتر ہے بلکہ نسلی تفاخر کی بنیاد پر اپنے آپ کو آدم سے افضل قرار دیا۔اس ابلیسی حسد و عناد کے تتبع میں ہی اس روئے زمین پر نژاد ونسل پرستی کی روایت قدیم الایام سے چلی آ رہی ہے۔ قدیم رومی و یونانی تہذیب ، و یدک عہد کے اہل ہنود، قبل از اسلام کی فارسی تہذیب اور عہد جاہلیت کے عرب نژاد پرستی اور انسانوں کو غلام بنانے کے سرخیل رہے ہیں۔ قدیم رومی و یونانی نژاد پرستی اور انسانوں کو غلام بنانے کے لیے تاریخ میں ایک خاص شہرت و اہمیت کے مالک رہے ہیں ان کے بقول انسان قدرتی طور پر فطری صلاحیتوں کے

حوالے سے ایک دوسرے کے ساتھ کافی اختلاف رکھتے ہیں ۔ کچھ ان میں جیسے یونانی و رومی پیدائشی طور پر اعلیٰ صلاحیتوں اور خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں جس کی بدولت وہ عالی حسب اور آقا قرار پاتے ہیں اس کے برعکس کچھ اقوام (سیاہ فام وغیرہ) ایسے بھی ہیں جو پیدائشی طور پر اعلیٰ صلاحیتوں اور خصوصیات سے محروم اور ضعیف و زبوں ہوتے ہیں ایسی نچلی ذات کے لوگ قدرتی طور پر ان کی نظر میں غلامی و بردگی کے لیے سزاوار ٹھہرتے تھے۔ قدیم اہل ہنود کے یہاں نژاد پرستی ایک دینی و مذہبی رنگ میں موجود تھی اور شاید دنیا کی سب سے بدترین نسل پرستیوں میں سے یہ ایک تھی۔ ہندوؤں کا مذہب ذات پات کے تصور کا حامل ہے جس کے مطابق دنیا کی سب سے اعلیٰ ذات برہمنوں کی ہے اور اور سب سے پست لوگ شودر و دلت اور دوسرے اقوام و مذاہب کے پیروکار ہیں۔ اسی طرح ایرانیوں اور عہد جاہلیت کے عربوں اور دیگر دوسرے اقوام کا حال یونانیوں ورومیوں اور ہندوؤں سے کچھ زیادہ اس حوالے سے مختلف نہ تھا وہ بھی بری طرح نژاد پرستی کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔

نژاد پرستی صدیوں سے انسانیت کا خوں بھاتی آرہی ہے کیونکہ یہ طول تاریخ میں مختلف اقوام کے درمیان خوں آشام جنگوں اور غارت گریوں کا سبب واقع ہوئی ہے۔ اس جدید عہد میں بھی کتنی ہی ایسی جنگیں لڑی گئیں جن کا بنیادی ریشہ اسی نژاد پرستی ہی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ غرض انسانیت اس کی تباہ کاریوں سے تنگ آچکی ہے اور اس کا کوئی راہ حل تلاش کر رہی ہے۔ بقول اقبال اس کا راہ حل صرف اسلام کے پاس ہے کیونکہ اسلام ہر طرح کی نسلی برتری اور امتیازات کا سخت مخالف ہے اور ان چیزوں کو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن مانتا ہے :

> اسلام ہمیشہ رنگ ونسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے نہایت کامیاب حریف رہا ہے ... اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ ونسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوع انسان سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس

اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کردیں۔[19]

اسلام تکوینی وتخلیقی طور پر بنی نوع انسان کی وحدت و اخوت کا قائل ہے چنانچہ قرآن مجید میں صاف لفظوں میں اس وحدت کا منشور یوں آیا ہے ۔

یا ایھا الناس اِنا خلقنکم مِن ذ کرِ و انثیٰ و جعلنکم شعو باَ و قبایلَ لَتعارفو اِن اکر مکم عنداللّٰہ اتقکم... الخ[20]

(ترجمہ: اے لوگوں میں نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا اور عزیز وہ ہے جو تمہارے درمیان سب سے زیادہ پر ہیز گار ہے ۔)

اسلام انسانی معاشرے کے درمیان رنگ ، نژاد ونسل یا کسی بھی دوسری بنیاد پر امتیاز و تبعیض کا قائل نہیں ہے ۔ اس کی نظر میں سبھی انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے برابر ہیں کیونکہ سبھی ایک ماں باپ سے پیدا ہوے ہیں۔ ہاں اگر کوئی امتیاز و برتری کا معیار اسلام کے نزدیک ہے وہ تقویٰ پر مبنی ہے جو انسان سب سے زیادہ متقی یعنی نیک سیرت ہوگا وہ خدا کے نزدیک سب سے اعلیٰ اور دوسروں سے ممتاز قرار پا کر انسانی معاشرے میں سروری و سرفرازی کا سب سے زیادہ اہل قرار پاتا ہے۔ خدا کی ذات سے قرب کا معیار انسانی اجتماع میں نژاد پرستی کے ابلیسی دلدل سے انسانوں کو نجات دے سکتا ہے ۔ عرب کو عجم پر سفید کو سیاہ پر اور اعلیٰ کو ادنیٰ وغیرہ پر کوئی فضلیت حاصل نہیں ہے سوائے اسی قرب کے ۔ اس کے سوا امتیاز و برتری کے جتنے بھی معیار ہیں وہ اسلام کی نظر میں ابلیسی معیارات قرار پاتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ تاریخ کے اس حساس مرحلے پر مشرق ومغرب میں بدترین نوعیت کی نژاد پرستی اور غلامی کا دور دورہ ہے اگر چہ آج کی نژاد پرستی اور غلامی کی ہیئت پرانے زمانوں کی نژاد پرستی و غلامی سے کافی مختلف ہے مگر روح دونوں کی مشترک ہے اور وہ انسانوں کو اپنا غلام بنانا ہے۔ مغربی مما لک نسل پرستی کی اس زد میں خصوصی طور پوری طرح آچکے ہیں ،وہاں کا ہر ملک نسل پرستی اور اس سے جڑے مسائل کے مقابلے میں ناتواں ہو چکا ہے۔ برطانیہ ہو یا فرانس یا امریکہ سب نسل

پرستی کی دلدل میں پوری طرح پھنس چکے ہیں امریکہ کا حال اس حوالے سے سب سے زیادہ ناگفتہ بہ و بحرانی ہے۔ وہاں آئے دن عام فائرنگ اور پولیس فائرنگ (Gun Violence) کے واقعات میں سینکڑوں لوگ لقمہ اجل بنتے ہیں جن میں اکثریت سیاہ فام لوگوں کی ہوتی ہیں اور پولیس فائرنگ کے ان واقعات میں بنیادی طور پر نسل پرستی ہی کا انگیزہ مضمر ہوتا ہے۔ اسی طرح برطانیہ اور فرانس کا حال بھی بہت ہی بھیانک ہے۔شکیل شفائی کے بقول:

> برطانیہ میں نسل پرستی اس قدر بھیانک ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس عظیم ملک میں اسکول جاتے بچے اس کی زد سے محفوظ نہیں ہیں ۔ ملک کی راجدھانی لندن کی یہ حالت ہے گھر سے ایک میل دور تک بھی بچے اگر بند بسوں کے اندر نہ جائیں تو نسلی حملوں سے ان کے محفوظ رہنے کی ضمانت ہی نہیں رہتی۔نسل پرستی کے معاملے میں فرانس کی صورت حال بھی برطانیہ سے بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ غیر فرانسیسی نژاد کا حادثہ کرا دینا یا گولی سے اڑا دینا عام بات ہے۔ اس عمل شرمناک میں حکومت کی پولیس بھی اسی طرح شریک رہتی ہے۔ ایک رپورٹ کے موجب فرانس میں نسل پرستی کا لے سیلاب کی طرح ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے ۔[۲۱]

علاوہ بریں نژاد پرستی نے بیسویں صدی میں بلکہ پوری تاریخ میں جو بدترین المیہ خلق کیا وہ فلسطین کا مسئلہ ہے۔نسل پرست صہیونیوں نے استعماری طاقتوں کی پشت پناہی سے فلسطین کی تاریخی سرزمین پر دھاوا بول کر فلسطینیوں کی نسل کشی بڑے وسیع پیمانے پر انجام دی اور اس کے علاوہ فلسطینیوں کو اپنے وطن اور گھر بار سے زبردستی نکال کر آوارہ وطن کر دیا۔ چناں چہ اس وقت پوری دنیا میں ساٹھ لاکھ سے زیادہ فلسطینی پناہ گزینوں کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔صہیونی اسرائیلی ریاست جس کا قیام 1948 ء میں عمل آیا کا بنیادی ہدف ومقصد پوری دنیا میں نسل پرستی کو فروغ دینا ہے۔ چونکہ صہیونیت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی نسل پرست

تحریک (Apartheid Regime) ہے اس لیے وہ کوشاں ہے کہ کس طرح پوری دنیا اور بالخصوص اسلامی ممالک میں نسل پرستی کو فروغ دے کر انہیں تباہ و برباد کیا جائے اور یوں اپنے استعماری عزائم کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

نژاد پرستی کی طرح وطنیت یا قومیت کا سیاسی تصور بھی اقبال کی نظر میں ابلیس کے مظاہر میں سے ایک نمایاں مظہر ہے جو نسل پرستی اور علاقائی و جغرافیائی وغیرہ بنیادوں پر استوار ہوتا ہے علاوہ بریں یہ تصور تعصب اور تنگ نظری پر مشتمل ہے جس کی بدولت پچھلے دو ڈھائی سوسالوں سے اس نے دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان مخاصمت و نفرت کے فروغ اور خوں ریز جنگوں کے ایک نہ تھمنے والے سلسلے کو جنم دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں قوم پرستی کی تعریف اور اس کی تبہکاریوں کے حوالے سے یہ غور طلب بیان ملتا ہے:

> Nationalism loyalty and devotion to ones nation or country ... Before the era of the Nation-State the primary allegiance of most people was to their immediate locality or religious group. The rise of large centralised states weakened local authority and society's increasing secularization weakened loyalty to religious groups... Nationalism is considered a major contributing cause of the World 1, World II and many other wars of the modern era.[۲۲]

قوم پرستی بین الاقوامی وحدت انسانی کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ اب تک دو عظیم عالمی جنگوں اور دوسری لاتعداد خوں ریزیوں کا باعث بنی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔قومیت اور قومی تعصّبات نے دنیا کی جدید تاریخ میں سب سے پہلے مغربی اقوام میں سر ابھارا۔ یورپی اقوام میں قومیت کے مسئلے کے سر ابھارنے سے پہلے وہ لوگ کسی حد تک کلیسائی نظام اور اس کی سیاسی بالادستی سے وحدت و انسجام کے حامل تھے مگر نشاۃ الثانیہ کی مادی عقلیت پرستی نے مذہب او ر سیاست کو ایک دوسرے سے جدا کر کے ان کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کا پرچار کیا جس کی وجہ سے لادینی افکار نے زوروں سے اپنی خاکستر سے سر ابھار کر پوری دنیا کو اپنی گرفت میں

لے کر کلیسائی نظام کے نیم مردہ جسد پر آخری کاری ضرب لگا کر ایک نئے سیاسی، ثقافتی اور اجتماعی نظام کی بنیاد ڈال دی۔نشاۃ الثانیہ کا خلق کردہ یہ نیا سیاسی نظام آگے چل کر ایسی ریاستوں کو معرض وجود میں لایا جو فقط قومیت و وطنیت کے نظریے پر ٹکی ہوئی تھی۔امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ تعصب و تنگ نظری پر مشتمل یہ وطنی نظریہ اپنے محدود قومی و نسلی مفادات و مصالح کے تحفظ کی خاطر یورپی اقوام میں رقابت و آپسی مخاصمت کا سبب بنا، جس کے نتیجے میں ان کے درمیان بڑی خوں آشام جنگیں چھڑ گئیں جن میں لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ مزید برآں یہ جنگیں بین الاقوامی سطح پر نا امنی اور انتشار و افتراق کا باعث بنیں۔ اس جنگ طلب سرشت اور لادینی ماہیت کو مدِ نظر رکھ کر اقبال قومیت و وطنیت کے یورپی و مغربی تخیل کو ایک روحانی بیماری کے مترادف قرار دیتے ہیں:

قومیت کا مغربی تخیل ایک روحانی بیماری ہے۔[۲۳]

قومیت کو ایک روحانی بیماری کے مترادف قرار دے کر اذہان میں جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ خود اقبال کسی زمانے میں اس کے بڑے شیدائی و پرستار رہے ہیں۔ ان کے بقول:

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا[۲۴]

(ترانہ ہندی)

اقبال کے افکار میں قوم پرستی کے حوالے سے یہ تضاد و تناقص کیسا ہے؟ دراصل انہوں نے اپنی فکری و تخلیقی زندگی کے ابتدائی مرحلے میں جو وطن یا قوم سے متعلق شور انگیز اشعار یا مجموعی طور پر جوولولہ خیز نظمیں لکھی ہیں وہ ایک خاص دور کے سیاسی پس منظر اور اس دور کی پر آشوب سیاسی و اجتماعی صورت حال کے پیش نظر کہی گئیں ہیں۔ ان نظموں اور اشعار میں اقبال کا مقصود مغربی نوعیت کی وطن پرستی نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود وطن کی محبت ہے اور اپنے وطن سے دل سوزی کا جذبہ ان میں نمایاں ہیں۔ چونکہ اپنے وطن سے محبت اور دل سوزی کا جذبہ کوئی مذموم صفت نہیں ہے بلکہ ایک خوبی متصور ہوتی ہے اس کے برعکس اپنے وطن سے خیانت ایک قبیح فعل مانا جاتا ہے۔ یہی وجہ مانی جاتی ہے کہ اقبال نے اسی لیے وطن دوستی کے حوالے سے اپنی

فکری حیات کی ابتدائی منزل میں ایسے وطن پرست اشعار کہے۔ بہرحال اس تضاد و تناقض کو جو اقبال کے وطنی افکار و نظریات میں سطحی طور پر نظر آتا ہے ۔ جاوید اقبال اسے واضح کر کے اقبال کے وطنیت سے متعلق نظریات میں پیش آمدہ تغیر و تبدل کو علل و اسباب کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں:

> یورپ میں قیام کے دوران میں ان کے نظریات میں تغیر آیا اور وہ ''قوم پرستی'' کے تنگ اور محدود تصور سے ذہنی آزادی حاصل کر کے انسان دوستی یا ''ہیومنزم'' کے اصولوں پر اپنے لیے ایک نئی راہ تلاش کر چکے تھے۔ علامہ نے یورپ میں ''قوم پرستی'' کے جذبے کو برسرِ عمل دیکھا اور انہیں احساس ہوا کہ یہ اصول زندگی اخلاق عالیہ اور انسان دوستی کے اصولوں کے برعکس ہے۔ انسان کو انسان سے نفرت کرنا سکھاتا ہے، انسان کو خودغرض بناتا ہے اور اس میں ملک گیری اور استحصال کی حرص پیدا کرتا ہے۔ قوم پرستی اور وطن پرستی کا جو تصور یورپی لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر حاوی تھا اس کا نتیجہ یورپی قوموں کے آپس میں حسد ، جنگ و جدل اور قتل وغارت کی صورت میں رونما ہوتا رہا ہے۔ [۲۵]

اسی لیے اقبال جنگ و جدل ،قتل غارتگری اور انتشار و افتراق پر مبنی قومیت سے اقوام عالم کو بالعموم اور ملت اسلامیہ کو بالخصوص بچنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں قوم پرستی سے ملت کی وحدت و یکسوئی کو بہت خطرہ لاحق ہے۔ علاوہ بریں قوم پرستی کی نژاد پرستانہ اور علاقائی و جغرافیائی جکٹ بندیاں بنیادی طور پر اسلامی نصب العین کے عین مخالف ہے۔ اسلام کا سیاسی نصب العین بلکہ مجموعی طور پر ساری اسلامی تعلیمات ملت کو ایک وحدت میں پروتی ہے۔ اسلام انسانی وحدت کا قائل و حامی ہے اور نژادی ولسانی یا جغرافیائی اختلافات پر بنی نوع انسان کے انقسام کا سخت مخالف ہے۔مسلمان کے لیے وطن یا قوم کی حد بندی اور مرز بوم کا تعین مذکورہ بالا امتیازات و اختلافات کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعین کلمہ توحید کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

جہاں اور جس جگہ اسلام کی عملداری اور وجود ہے وہاں اسلامی نصب العین کے مطابق ایک مسلمان کا وطن قرار پاتا ہے ۔اس پہ مستزاد یہ کہ دین اسلام کا ویژن آفاقی نوعیت کا ہے اور وہ ہر مسلمان و ہر انسان کو اس آفاقی ویژن کا پیرو دیکھنے کا متمنی ہے کیونکہ اس ویژن کی بدولت ایک انسان وطنیت وقوم پرستی کی مقرر کردہ غل و زنجیر سے آزاد ہو کر عالم گیر سطح پر ایک سیاسی و اجتماعی وحدت کا نمائندہ بن کر ابھر کر سامنے آتا ہے جس کے سامنے وطنی مرزبندیوں کے بت پاش پاش ہو کر کافور ہوتے ہیں اقبال اسی لیے کہتے ہیں:

قلب ما از ہندوروم و شام نیست
مرزبوم او بجز اسلام نیست[۲۶]

(ترجمہ: ہمارا ویژن اور ہماری فکر ہند و روم اور شام کی حد بندی کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے نصب العین کی بس ایک حد بندی ہے اور وہ اسلام ہے۔)

مگر افسوس کہ قومیت کے بت نے ملت کی اسلامی وحدت کو ہر سطح پر تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ نتیجتاً ملت سینکڑوں ٹکڑیوں میں بٹ کر رہ گئی۔ بقول مولانا ابوالحسن ندوی اقبال اسی لیے قومیت کے سخت مخالف تھے کیونکہ:

> آج کل کی چلی ہوئی قومیت (Nationalism) اور وطنیت جس کا سرچشمہ یورپ کی سرزمین ہے اقبال کی نظر میں شرک اور بت پرستی سے کم نہیں۔ انہیں اسلام اور قوم پرستی میں کھلا تضاد نظر آتا ہے اور وہ اسے غارت گر دین اور اس کے پیرہن کو مذہب کا کفن بتاتے ہے۔[۲۷]

مغربی استعمار نے عرب وعجم ترک و تتار اور کتنے ہی ناموں سے تقسیم در تقسیم کے انتشار انگیز منصوبے کے تحت مسلمانوں کے حصے بخرے کیے۔ خلافت عثمانیہ کی صورت میں انگریزی استعمار کے خلاف ایک کمزور ہی سہی مگر اقبال کے زمانے کی صورت حال کو مدنظر رکھ کر ایک ایسا سد محکم کھڑا تھا جو استعماریوں کے شیطانی مقاصد و مفادات کو نقش بر آب کرنے میں اپنا نمایاں رول ادا کر رہی تھی۔ بد قسمتی سے اسلامی ممالک استعمار کے اثر ونفوذ سے زیادہ دیر تک محفوظ نہ رہ

سکے چناں چہ مشرق وسطی کے عرب ممالک مغربی استعمار کی قوم پرستانہ تبلیغات کی یلغار سے متاثر ہوکر ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجے میں کچھ سالوں کے عرصے ہی میں خلافت عثمانیہ کا ۲۲۔۱۹۲۱ ء میں دردناک وعبرت انگیز صورت میں خاتمہ ہوگیا۔ خلافت کا خاتمہ ہوکر ہی استعمار نے اسلامی دنیا کے عین قلب یعنی جزیرہ نمائے عرب میں اپنا تسلط جما کر عرب دنیا کو مختلف ملکوں کے ناموں پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر ہمہ گیر انداز سے لوٹنا شروع کیا۔ دراصل اسلامی ممالک میں قوم پرستی کو فروغ دیکر سامراجیوں کا ہدف ومقصد یہ تھا کہ اسلام کے ساتھ ان قوموں کا رشتہ و رابط ضعیف ہوکر دھیرے دھیرے ختم ہو جایے گا۔ جس کا حتمی نتیجہ اس صورت میں برآمد ہوگا کہ مسلمانوں کے درمیان آپسی وحدت و یکسوئی ختم ہو جایے گی۔ سامراجی طاقتیں اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اسلام قوم پرستی کی حائل دیوار کو مسلمانوں کے درمیان میں سے ہٹا کر انہیں متحد کر کے ایک قدرتمند وعظیم ملت واحدہ کی صورت میں متشکل کرسکتا ہے ،اسی واقعیت کے پیش نظر عالمی سامراج نے اپنی ریشہ دوانیوں اور زہریلے پروپیگنڈے سے امت کے درمیان قوم پرستانہ جذبات و احساسات کو بڑے پیمانے پر ہوا دی جس کے مہلک اثرات سے بالآخر ملت واحدہ کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اقبال قوم پرستی کی ان ہولناک تباہ کاریوں کے عینی شاہد رہے ہیں وہ مغرب کے اس شیطانی کھیل کا جو انہوں نے قوم پرستی کے نام پر دنیائے انسانیت اور ملت اسلامیہ کے ساتھ کھیلا انتہائی مذموم گر دانتے ہیں اور مغربی دنیا میں جس نے قوم پرستی کی وبا اور عیاری وفریب کاری کو بڑی مستحکم فکری بنیادیں فراہم کیں اسے اقبال مرسل شیطان کا خطاب عطا کرتے ہیں۔ بقول انکے:

دہریت چوں جامہ مذہب درید
مرسلے از حضرت شیطان رسید
آں فلارنساوی باطل پرست
سرمہ او دیدہ مردم شکست

(ترجمہ: لا دینی افکار نے جونہی مذہب کا پیرہن چاک کیا تو شیطان کی طرف سے ایک پیغمبر مبعوث ہوا۔ وہ شہر فلورنس کا باطل پرست (میکیاولی) ہے جس کے افکار سے لوگ قوم پرستی کے جنون میں اندھے ہو گئے۔)

نسخہ بہر شہنشاہاں نوشت
در گل ما دانہ پیکار کشت
مملکت را دین او معبود ساخت
فکر او مذموم را محمود ساخت[۲۸]

(رموز بیخودی)

(ترجمہ: اس نے بادشاہوں کے لیے ایک نسخہ لکھا (اشارہ میکیا ولی کی کتاب کتاب الملوک کی طرف ہے) اور اس طرح ہمارے درمیان جنگ و جدل کے بیج بود یے اس نے قوم پرستی کو ایک مملکت کے لیے معبود کے مترادف قرار دیا۔ اس طرح اس کی فکر نے ایک مذموم چیز کو کس آسانی کے ساتھ ایک ممدوح چیز بنا دیا۔)

عصر حاضر میں وطنیت وقوم پرستی کی بر بادیوں وخوں آشامیوں کا دور دورہ سنگین سے سنگین تر ہوتا جارہا ہے اور انسانی معاشرہ اس کے مہلک اثرات سے ایک بحرانی صورت حال سے دو چار ہے۔ بین الاقوامی سطح پر قوموں کے درمیان باہمی روابط کے حوالے سے ایک مسموم فضاء پائی جاتی ہے ،یہ مسموم فضاء قوموں میں آپسی روابط کی کشیدگی، بدگمانی اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کی وجہ سے دن بدن تیرہ وتارہو رہی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس دگرگوں فضاء میں دنیا کی مختلف قومیں بالخصوص بڑی عالمی استعماری طاقتیں عام تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں (Weapons of mass destruction) سے دن بدن لیس ہو رہی ہیں جنھوں نے عالم بشریت کو انقراض وتباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس مکدر فضا میں افسوس کی بات یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح کے نام نہا دامن وسلامتی کو قائم کرنے والے ادارے جو بڑی طاقتوں کے آلۂ کار بن چکے ہیں خاموش تماشائی بن بیٹھے ہیں۔ اس پہ مستزاد یہ کہ یہ ادارے کمزوروں کے استحصال و استیصال کے ساتھ عالمی استکبار کے ناجائز مفادات کے تحفظ کی خاطر سرگرم عمل ہیں۔

یہ سب نتیجہ اور دین قوم پرستی کے دیو استبداد کی ہے۔قوم پرستی کے اسی تخریبی تناظر کو مدنظر رکھ کر اقبال جس چیز کو انسان کے لیے اہم قرار دیتے ہیں وہ اس کا عقیدہ ، اس کی تہذیب اور تاریخی روایت ہے نہ کہ قوم پرستی کا ابلیسی وملحدانہ رجحان بقول ان کے :

میں قومیت کے خلاف ہوں ... میں تو اس لیے اس کا مخالف ہوں کہ میں اس میں ملحدانہ مادیت کے جراثیم دیکھتا ہوں جنہیں میں آج انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہوں۔ حب الوطنی بالکل طبعی صفت ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں‌اس کے لیے جگہ ہے لیکن جو چیز اصل اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کا عقیدہ ہے اس کی تہذیب ہے ، اس کی تاریخی روایت ہے میرے نزدیک یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لیے انسان کو زندہ رہنا چاہیے اور جان قربان کر دینی چاہیے نہ کہ زمین کے اس ٹکڑے کے لیے جس میں انسان کی روح کو عارضی طور پر رہنا پڑتا ہے۔ [۲۹]

عقیدہ، تہذیب اور تاریخی روایات کے عظیم اقدار کی پاسداری کے لیے جو جماعت اقبال کی نظر میں سب سے زیادہ اصلح اور اہل ہوسکتی ہیں وہ مسلمانوں کی جماعت ہیں مگر افسوس کہ مسلمان عصر حاضر میں دوسرے اقوام سے زیادہ ہی قومی نوعیت کے افتراق وخلفشار کے شکار نظر آتے ہیں جس کے آثار اقبال کے زمانے میں ہی ظاہر ہو چکے تھے۔عصبیت پر مشتمل قوم پرستی کے فجائع جن سے امت دو چار ہوئی اور ان فجائع کے خلاف مسلمان کی دعوت وعزیمت کی اقبال نے بانگ درا میں موجود نظم ''وطنیت'' (یعنی وطن بحیثیت سیاسی تصور کے) میں یوں نقاب کشائی کی ہے :

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے [۳۰]

اسلام نہ تو نیشنلزم کا حامی ہے اور نہ استعمار کا داعی بلکہ وہ قوموں کے اتحاد و یگانگت کا خواہاں ہے مزید برآں جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ اقبال کے بقول اسلام کا قومیت کے متعلق ایک مخصوص تصور و نقطۂ نظر ہے جس کی بنا نہ اشتراک زباں ، نہ اشتراک وطن اور نہ ہی نسلی و دیگر دوسرے مسائل پر ہے۔ بلکہ اس کی اساس ایک خاص ایمان وعقیدے پر استوار ہے جس کے متعلق وہ کہتے ہیں:

ملت اسلامیہ اور دنیا کی دوسری اقوام کے درمیان بنیادی فرق ہمارا مخصوص

تصور قومیت ہے۔ ہماری قومیت کا بنیادی اصول نہ اشتراک زبان یا نہ اشتراک وطن اور نہ ہی اشتراک معاشی مفادات ہے۔ایسا اس لیے ہے کہ ہم اس کائنات کے بارے میں ایک مخصوص عقیدہ رکھتے ہیں اور ہم ان تاریخی روایات کے امین ہیں جن کی بنا پر ہم اس معاشرے کے رکن ہیں جس کی بنیاد پیغمبرؐ اسلام نے رکھی تھی۔ [۳۱]

اس اصول و معیار کے علاوہ امت کے سامنے اگر کوئی دوسرا معیار ملت وقومیت کے حوالے سے ہوتو اقبال اس کو بولہبی معیار قرار دیتے ہیں۔چناں چہ وہ حسین احمد مدنی کے تصور قومیت پر اپنے شدید محاکمے میں کہتے ہیں :

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیو بند حسین احمد ان چہ بو العجبی است

(ترجمہ :عجم (مراد عام مسلمانوں سے ہیں) ابھی تک دین کے اسرار رموز سے واقف نہیں ہیں ورنہ دیو بند کے حسین احمد سے ایسی حیران کنندہ اور افسوس ناک بات سرزد نہ ہوتی۔)

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

(ترجمہ :انہوں نے منبر سے کہہ دیا کہ ملت کا تعلق وطن سے ہے(نیشنلزم کی طرف اشارہ ہے) یعنی ہر ملک میں بسنے والے لوگ ایک ملت کو تشکیل دیتے ہیں۔یہ کہہ کر انہوں نے آنحضورؐ کی منزلت و مرتبے سے بے خبر ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔)

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است [۳۲]

(حسین احمد)

(ترجمہ:تو اے مسلمان اپنے آپ کو حضور اکرمؐ کی ذات والا کے ساتھ وابستہ کر لے کیوں کہ ان کی ذات ہی مکمل دین ہیں۔اگر تو حضورؐ کے ساتھ وابستہ نہ ہوا تو تیرے سارے اعمال و نظریات ابولہب کے سے ہیں۔)

اقبال نے مذکورہ بالا اشعار میں قوم پرستی اور ملت اسلامیہ کے اس حوالے سے نصب العین کے درمیان حد فاصل کھینچی ہے۔جس کے ایمانی سرے پر پیغمبرؐاسلام کی ذات گرامی تلمیذالرحمٰن کی صورت میں انسانی وحدت واخوت کی صورت میں جلوہ گر ہے اور دوسرے کفر آمیز سرے پر ابولہب ابلیسی صورت میں قومی تعصّبات کو ہوا دینے میں مشغول ومنہمک نظر آتا ہے۔

قوم پرستی کی طرح ابلیس کے خاکی مظاہر میں ملوکیت بھی اقبال کے فکر وفن میں ایک اہم مظہر کے طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ملوکیت ایک ایسا طرز حکومت ہے جو مطلق العنان اور آمرانہ خطوط پر گامزن ہوتا ہے۔ ایسا طرز حکومت عملاً کسی آئین و لائحہ عمل کا پابند نہیں ہوتا ہے بلکہ اس طرز حکومت میں ایک شخص واحد کی ذات ہی خود آئین وقوانین کی آخری سند ہوتی ہے۔یہ شخص واحد اپنے سے بالا تر کسی احتسابی قوت کے آگے جوابدہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ساری مملکت و رعایا اس خود سر وخود رائے قوت کے آگے سرخم و جوابدہ ہوتی ہیں۔ آئینی بادشاہتوں کو چھوڑ کر دنیا کی تقریباً ساری ملوکیتوں میں جمہور کی حیثیت غلاموں جیسی ہوتی ہے اور وہ اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہوتے ہیں۔ جہاں تک ملوکیت کے حق حاکمیت اور مشروعیت کا تعلق ہے تو ملوکیت یہ کسی بھی نمائندہ قوت و طاقت یا ادارے سے حاصل نہیں کرتی ہے ،اس کی مشروعیت کی بس ایک واحد سند و دلیل طاقت و زور گوئی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ موروثیت کا پہلو ملوکیت کو مشروعیت عطا کرنے میں اس کے آغاز سے ہی پیش پیش رہا ہے۔اس واقعیت کو مد نظر رکھ کر ملوکیت اپنی بقاء اور تداوم کے لیے ایک شورای وعوامی حکومت کا خاتمہ اپنے لیے نا گزیر سمجھتی ہے ،اس ہدف و مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ملوکیت اور اس کے دوسرے معاون عناصر ایک معاشرے میں ہر سطح پر فعال ہو کر شورای وعوامی نظام حکومت کے سقوط وانہدام کے لیے ہم دست ہو کر اپنی حکمت عملی وضع کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ ایک جمہوری حکومت میں عدلیہ کا شعبہ اپنے کلیدی کردار کے تناظر میں ایک اہم و موثر شعبہ مانا جاتا ہے۔ جس کے آزادانہ و مستقل رول پر ایک مملکت میں عدل و

انصاف اور مساوات کے قیام کا دار ومدار ہوتا ہے ،مگر ملوکیت اپنے ظلم و استبداد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایسی ایک آزاد و مستقل عدلیہ کو اپنے اقتدار اور اپنی موجودیت کے لیے ایک سنگین خطرہ سمجھ کر اسکا قلع قمع کرتی ہے اور اس کی جگہ ایک ایسی کمزور و غیر مستقل یا دوسرے لفظوں میں ایک مخملی نوعیت کی عدلیہ کو جا گزیں کرتی ہے جو ملوکانہ و طاغوتی خواہشات کی بر آری کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔علاوہ بریں جمہوری و شورای حکومت میں عوام آزادی اظہار رائے کے حق سے متصف ہوتا ہے جس کی بدولت وہ حکومت اور اس کی ناہموار و نامناسب پالیسیوں اور تخریبی کارروایوں کو ہدف تنقید بنا کر اپنی مخالفت کا اظہار کرتے ہیں یوں ایک ہئیت حاکمہ اپنی پالیسیوں اور اپنی حکمت عملی میں اصلاح کے لیے مجبور ہوتی ہے نتیجے میں عوام اور ہئیت حاکمہ کے باہمی روابط میں ایک تعادل وتوازن برقرار رہتا ہے جس سے آمرانہ اور استبدادی امکانات و رجحانات کا خدشہ دور ہوتا ہے۔ برعکس اس کے نظام ملوکیت میں آزادی اظہار رائے کو عوام سے کلی طور پر سلب کر لیا جاتا ہے تاکہ خود سرانہ اور استبدادی پالیسیوں و اقدامات کو بلاعوامی چوں و چرا کے نافذ کیا جا سکے۔اس طاغوتی روش کو بفرض مثال غیر الٰہی و غیر اسلامی نقطۂ نگاہ سے تو روا رکھا جاسکتا ہے مگر اسلامی نقطۂ نظر سے ملوکانہ طاغوتیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اسلام کی رو سے حاکم اصلی و واقعی خدا ہے اور اسی کی ذات کواصل میں حق حاکمیت حاصل ہے چناں چہ ارشاد باری ہے:

"ان الحکم الا لِلّٰہِ... الخ[۳۳]

(ترجمہ:حکم اللہ کے سوا کسی کو سزا وارنہیں ہے۔)

یا دوسری جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے :

الا لہ الخلق ولامرُ[۳۴]

(ترجمہ: آگاہ ہو جاؤ کہ اسی کی (خدا کی) خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔)

ان آیات مبارکہ سے صاف طور پر یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی نصب العین کی رو سے کسی انسان یا نظام کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنا اقتدار اور اپنی حکومت انسانوں پر نافذ کریں

الا یہ کہ کسی فرد یا کسی ایسے نظام کو ذات باری کی طرف سے اعتباری طور پر حق حاکمیت تفویض ہوا ہو۔اسلام میں حکومت کا سر چشمہ الٰہی تعلیمات و احکامات کو قرار دیا جاتا ہے جن سے ملوکیت کالعدم ٹھہرتی ہے جبکہ مغرب میں حکومت و اقتدار اعلیٰ کا سر چشمہ غیر الٰہی و مادی تعلیمات پر مبنی ہیں اس لیے وہاں ملوکیت کا امکان ہر وقت موجود تھا۔ چناں چہ نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس حوالے سے ابلیس کہتا ہے :

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں[۳۵]

افسوس کی بات یہ ہے کہ مغربی دنیا میں ملوکیت کا تقریباً رسمی طور پر خاتمہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے ساتھ ہی ہوامگر اسلامی دنیا آج بھی اکثر جگہوں پر اس کے تازیانے سہہ رہی ہیں۔جس اسلامی نظام حکومت کی بنیاد جمہوری روح پر استوار تھی اس کی تقلیب ماہیت کر کے اس کی جگہ ایک مستبدانہ اور آمرانہ عنصر کو داخل کیا گیا یوں جمہوری خلافت ایک تانا شاہی میں تبدیل ہوئی۔ یہ تباہ کن تبدیلی کب اور کیسے عمل میں آئی اس کے پیچھے تاریخی علل و اسباب کا ایک پر پیچ طومار موجود ہے جس کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں:

> تاریخ اسلام کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ کس طرح شیطان اسلام کے ابتدائی دور میں ہی جمہوریت کا خاتمہ کر کے مسلمانوں پر اموی آمریت نافذ کرنے میں کامیاب ہوا، کیونکر مسلمانوں کے ذہنوں میں نسلی ، قبائلی،فرقہ وارانہ اور دیگر قسم کے تعصّبات اُجاگر ہوئے کس طرح دنیائے اسلام کی وحدت پارہ پارہ ہوئی اور ایک کی بجائے ممالک اسلامیہ میں بیک وقت تین مختلف خلافتیں وجود میں آئیں ، خلافت عباسیہ کے آخری دور یعنی بارھویں صدی عیسوی میں کیونکر امت محمدیؐ سلاطین و ملوک کے ظلم وستم کا نشانہ بنی۔نوبت یہاں پہنچ گئی کہ عامتہ المسلمین کے سامنے دو رستے تھے -استبداد یا ابتری-اس دور میں امام غزالی نے مشورہ دیا کہ استبداد کو قبول کرو لیکن

ابتری کی راہ کسی صورت میں بھی اختیار نہ کرو۔مسلمانوں نے امام غزالی کی رائے پر عمل کیا اور استبداد کو بسر وچشم قبول کیا۔لیکن چند سو سالوں کے بعد یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد پر منگولوں کے حملے کے باعث دنیائے اسلام میں ایسی ابتری پھیلی کہ تاریخ اقوام میں اس کی مثال تک نہیں ملتی۔تاریخ اسلام ہمیں یہ عبرت ناک سبق سکھاتی ہے کہ ابتری دراصل استبداد کی علت یا نتیجہ ہے۔جب کسی قوم کی تباہی قریب ہو تو پہلے دور استبداد آتا ہے اور پھر ابتری ایک وبا کی طرح پھوٹتی ہے۔ [۳۶]

عوام ابتری اور ہرج و مرج سے نجات پانے کے لیے ملوکانہ استبداد کے ہاں پناہ لینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں اور استبداد اپنی منافقانہ پالیسی کے تحت ظاہراً ہر طرح کی ابتری و ہرج و مرج کے خاتمے کے لیے بہت سے نمائشی اقدامات انجام دیتا ہیں مگر پس پردہ استبداد معاشرے کو ہر طرح کے سیاسی واجتماعی خلفشار میں جھونکنے کے لیے سرگرم عمل رہتا ہے۔نسلی وقبائلی ،لسانی وعلاقائی اور فرقہ وارانہ اختلافات پھیلانا استبداد کی اولین ترجیحات میں شامل ہوتا ہے کیونکہ کسی قوم یا ملت کے باہمی انتشار وافتراق کے اندر ہی استبداد کو اپنی بقاء نظر آتی ہے۔اس پہ مستزاد یہ کہ فریب کاری اور عیاری کے ساتھ استبداد عوام کے قانونی حقوق و مطالبات کو غصب ہی نہیں کرتا بلکہ اپنا دام تذویر پھیلا کر وہ عوام سے بصیرت و آگاہی کی قوت کو بھی سلب کر لیتا ہے۔ بقول اقبال:

شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوق نخچیری [۳۷]

(ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض)

لوگ استبدادی عیاری و مکاری کے زہریلے پروپیگنڈے سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ وہ پوری طرح حقائق سے غافل ہوکر سیاسی وسماجی سطح پر گمراہیوں کا شکار ہوتے ہیں۔جب عوام سیاسی وسماجی سطح پرستی اور غفلت شعاری کا شکار ہوتے ہیں تو ملوکانہ استبداد اشراف وخواص

کے ساتھ مل کر خلافت و جمہوریت کو موروثی بنانے میں ، بیت المال کی حیثیت میں تبدیلی لا کر اسے لوٹنے، آزادی اظہار رائے کے خاتمے ، عدلیہ کی آزادی چھیننے، نسلی و قومی عصبیتوں کو فروغ دینے اور سب سے بڑھ کر قانونی بالادستی کا خاتمہ کرنے میں آسانی کے ساتھ کامیاب ہوتے ہیں۔اقبال ملوکیت کی ان چیرہ دستیوں کے متعلق جن سے کوئی بھی محفوظ نہیں کہتے ہیں:

ملوکیت سراپا تیشہ بازی است
از او ایمن نہ رومی نے حجازی است[۳۸]

(حضور رسالت)

(ترجمہ :ملوکیت سراسر مکاری و شعبدہ بازی ہے اس کے شر سے نہ رومی محفوظ ہے اور نہ حجازی۔)

خواص و اشراف کی حمایت کی بدولت ملوکانہ نظام کو اسلامی معاشرے میں امتداد زمانہ کے ساتھ ایک محکم اساس فراہم ہوئی۔خواص واشراف کے طبقے سے جو سب سے زیادہ اثر گزار گروہ ہوتا ہے وہ درباری ملاؤں پر مشتمل ہوتا ہے، جو تاناشاہوں کو اپنی مقدس تاویلات کے سہارے ظل اللہ کا مقام دلواتے ہیں اور ان کی بداعمالیوں و ناہنجاریوں کو احکام الہٰی اور سنت کے عین مطابق قرار دے کر انہیں یوں قانونی مشروعیت کا پروانہ عطا کرتے ہیں ۔ یہ درباری ملا اور مجموعی طور پر خواص و اشراف ہویٰ و ہوس کی خاطر دین و ملت کا سودا کر کے ملت کو تباہی و بربادی کے ایک عمیق چاہ میں دھکیل کر لوگوں کی ایک ایسی نہج پر ذہنی ونفسیاتی تربیت کرتے ہیں جو اسلام کی مترقی روح سے عاری ہو کے صرف فکری جمود وسخت گیری پر مشتمل ہوتی ہے۔اقبال ان درباری ملاؤں اورمن جملہ خواص و اشراف کو ارباب کیں سے معنون کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حکمت ارباب کیں مکر است و فن
مکر و فن؟ تخریب جاں تعمیر تن

(ترجمہ:ارباب کیں کی تعلیمات مکر وفریب پر مشتمل ہوتی ہے، مکر وفن کیا ہے؟ بس جس سے

جسد کی تعمیر ہوتی اور روح مردہ ہوتا ہے۔)

حکمتے از بند دیں آزادہ
از مقام شوق دور افتادہ

(ترجمہ: یہ تعلیمات دین کے حدود و قیود پر مشتمل نہیں ہوتی ہیں اور حقیقت جوئی کا کوئی شائبہ ان میں نہیں ہوتا۔)

مکتب از تدبیر او گیرد نظام
تا بکام خواجہ اندیشد غلام

(ترجمہ: ان انحرافی افکار و نظریات سے ایک مکتبہ فکر ایسا پیدا کیا جاتا ہے جو صرف استبداد کو خدمت کرنا اپنا فریضہ جانتا ہے۔)

شیخ ملت با حدیث دلنشیں
بر مراد او کند تجدید دیں

(ترجمہ: شیخ صاحب اپنی دلنشیں تاویلات سے اس استبداد کے حق میں دینی افکار و نظریات کو منقلب کرتا ہے۔)

از دم او وحدت قومی دونیم
کس حریفش نیست جز چوب کلیم[۳۹]

(حکمت فرعونی)

(ترجمہ: شیخ کے دم سے قومی وحدت کا پیکر دونیم ہوتا ہے اور اس کا مقابلہ عصائے موسیٰ کے سوا نہیں کیا جا سکتا یعنی اس کے مکر و شعبدہ بازی کو ناکام کرنے کے لیے عصاے موسیٰؑ ہی کارگر ہو سکتا ہے۔)

آزادی و فکری استقلال کو امت سے چھین کر استبداد عوام کو ہر طرح کے فساد میں جھونک دیتا ہے۔ لوگ بس تفنن طبع کی سرگرمیوں اور نام نہاد رفاہ میں اپنی عظیم جسمانی و روحانی توانائیوں اور صلاحیتوں کو کھو بیٹھتے ہیں۔ جس سے وہ ابتکار عمل اور قوت اختراع سے محروم ہو کر اغیار کے دست نگر بن جاتے ہیں۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ لوگ اپنے حق خود ارادی کو کھو کر استبدادی مشینری کو رواں دواں رکھنے کے لیے بے جان اور بے شعور مشینی پرزوں کی صورت اختیار کرتے

ہیں ،مزید یہ کہ استکبار اور استبداد معاشرے کے جسم سے ہر سرمایے کو چھین کراسے کھنکھناتی مورت میں تبدیل کرتا ہے جسے اس کھوکھلے پن کی بدولت آزادی و استقلال کے نام پر ڈرامائی انداز میں بہت بجایا جاتا ہے مگر اسی آزادی و استقلال سے درحقیقت وہ محروم ہوتا ہے۔ملوکیت پرمبنی داخلی استبداد اور خارجی استعمار ایک دوسرے کے ساتھ مل کرخصوصی طور پر جس چیز کی بیخکنی کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے وہ دین اور دینی شعائر کی روح ہوتی ہے۔دینی شعائر کی روح کا خاتمہ کر کے بعد میں دین کا ایک کارٹون(caricature) بناتے ہیں جسے وہ ایک کٹھ پتلی کی طرح اپنے مقاصد واہداف کی خاطر نچاتے رہتے ہیں۔بقول اقبال :

ہم ملوکیت بدن را فربہی است
سینۂ بے نور او از دل تہی است

(ترجمہ:یہی حال ملوکیت کا ہے یعنی عملی طور پر وہ بھی الحاد پرمبنی ہے ملوکیت کے تاریک سینے میں دل نہیں ہے کیونکہ وہ خدا پر ایمان نہیں رکھتی ہے۔)

مثل زنبورے کہ بر گل می چرد
برگ را بگذارد و شہدش برد

(ترجمہ:ملوکیت کی مثال اس شہد کی مکھی جیسی ہے جو پھولوں کا رس یعنی جوہر چوس لیتی ہے اورصرف پتے چھوڑ دیتی ہے۔بالکل اسی طرح سلاطین انسانوں کو جوہر انسانیت سے محروم کر دیتے ہیں۔)

شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل ہماں
بر جمالش نالہ بلبل ہماں

(ترجمہ:ظاہر میں شاخیں ، پتے اور پھول باقی ہوتے ہیں مگر روح سے عاری ہوتے ہیں اور بلبل پہلی کی طرح ان پھلوں کے رنگ و بو پہ فریفتہ رہتا ہے اورنغمہ سرائی کرتا رہتا ہے۔)

از طلسم و رنگ و بوئے او گذر
ترک صورت گوئے و در معنی نگر[1]

(اشتراک وملوکیت)

(ترجمہ:مگر تم کو اس ظاہری رنگ و بو کے طلسم سے آزاد ہو کر اس خوش کن صورت کے پیچھے جو انتہائی کریہہ صورت چھپی رہتی ہے کو دیکھنا چاہیے۔)

اقبال ملوکیت کی ابلیسی سرشت کے متعلق مزید فرماتے ہیں:

ہر دو را جان ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں نا شناس آدم فریب

(ترجمہ: ملوکیت مادی طور پر روح کی دشمن اور ذات باری کے منکر اور بنی آدم کو فریب دینے والی ہے۔)

زندگی ایں را خروج و آں را خراج
درمیاں ایں دو سنگ آدم زجاج

(ترجمہ:اشتراکیت کا مقصد خروج ہے یعنی مزدوروں کو سرمایہ داروں کے خلاف صف آرا کر کے انقلاب لانا چاہتی ہے اور ملوکیت کا مقصد خراج ہے یعنی سلاطین عوام سے خراج وصول کر کے ان کی خون پسینے کی کمائی سے اپنی عیش کوشی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔)

ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست
آں برد جاں را از تن نان را ز دست[۴۱]

(اشتراک وملوکیت)

(ترجمہ:اشتراکیت علم و دین اور فن کا خاتمہ کرتی ہے۔ اور ملوکیت اس سے بڑھ کر مکروہ فعل انجام دیتی ہے وہ یہ کہ لوگوں سے ان کی دینی روح کو سلب کرتی ہے اس کے علاوہ ان کے ہاتھ سے روٹی بھی چھین لیتی ہے۔)

ملوک و سلاطین اسلام کے جمہوری نظام کو صدر اول میں بھی جڑھ سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہوئے اور دور حاضر میں بھی اس کی نابودی کرنے کے حوالے سے کامران نظر آتے ہیں۔ملوکیت کی ابلیسی نیرنگ بازیوں کو امت مسلمہ کو اگرنا کارہ بنانا ہے تو اس کے لیے صرف ایک راہ حل باقی ہے اور وہ بقول اقبال ایک اسلامی جمہوریت یا دوسرے لفظوں میں خلافت الٰہی کے قیام میں مضمر ہے:

خلافت بر مقام ما گواہی است
حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است

(ترجمہ: خلافت ہمارے نصب العین اور فریضے کی گواہ ہے کہ ہم پر ملوکیت وسلطنت حرام ہے۔)

ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ
خلافت حفظ ناموس الٰہی است[۴۲]

(خلافت وملوکیت)

(ترجمہ: ملوکیت سراسر مکروفریب پرمبنی ہے اور خلافت دین اور ناموس الٰہی کی پاسبان ہوتی ہے۔)

ملوکیت جس طرح ایک سماج کو اپنی طرح طرح کی بوالہوسیوں کا شکار بناتی ہیں اسی طرح سرمایہ داری کا نظام بھی سماج کو اپنی ہوس زر کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ سرمایہ داری اساسی طور پر بلا روک ٹوک آزاد معیشت ذرائع پیداوار پر فردی و موروثی مالکیت، ذرائع پیداوار کے لحاظ سے معاشرے میں ایک رقابتی دوڑ کے فروغ اور نظام حاکم کی عدم دخالت کے اصولوں پر مبنی ہیں۔اس نظام میں چند بڑے افراد یا چند بڑے تجارتی گروہ کسی ملک کے جملہ ذرائع پیداوار میں اپنا سرمایہ لگا کر ان پہ اپنی اجارہ داری کو مسلط کرنے کے ساتھ ساتھ ان ذرائع کو اپنے دست تصرف میں لے کر اور مزدوروں کو تھوڑی سی اجرت دے کر ان کی محنت شاقہ سے پیدا شدہ اضافی سرمایے کو ہڑپ لیتے ہیں۔اس معاشی استحصال سے معاشرے میں طبقاتیت جنم لیتی ہے جو صد ہا اجتماعی، اقتصادی و سیاسی مشکلات کا سبب بنتی ہے۔جب ایک ملک کی ساری قومی دولت گنتی کے چند لوگوں میں سمٹ جاتی ہے تو فطری طور پر وہاں غریبی اور فقر و افلاس اپنے قدم جماتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کی حالت اس وقت فقر و افلاس کے حوالے سے بہت بری ہے چند مغربی و اسلامی ممالک کو چھوڑ کر باقی ساری دنیا غریبی و بھکمری سے بلک رہی ہے۔ افریقی ممالک کا حال اس حوالے سے سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہے وہاں کئیں ایسے ممالک ہیں جن کا شمار دنیا کے غریب ترین ملکوں میں ہوتا ہیں اور ان ممالک کے لوگ نان شبینہ کے محتاج ہیں۔ایشیا میں بھی صورت حال اتنی خوش آئند نہیں ہے کئیں ایسے ایشیائی ممالک ہیں جو اقتصادی بحران کی وجہ سے غربت وفقر کی لپیٹ میں آ کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔مجموعی طور پر کہا جا رہا ہے کہ اس

وقت دنیا کی آٹھ عرب آبادی میں سے ایک عرب لوگ ایسے ہیں جو شدید گرسنگی کا شکار ہیں اور لاکھوں کروڑوں ایسے ہیں جو کم غذائیت سے رنج اٹھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے کتنے ہی مشکلات و مصائب ہیں جو عصر حاضر میں دنیا کے عوام کو لاحق ہیں۔ان مصائب و مشکلات کا بنیادی سبب مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام ہے جو پچھلی دو تین صدیوں سے انسانیت کے خلاف برسر پیکار ہے۔ سرمایہ داری کے اس ابلیس نے اپنی ابلیسی حرص وطمع سے دنیا کی ساری دولت کو ہڑپ لیا ہے۔اقبال کے بقول ایسی سرمایہ داری دنیا کے لیے ایک لعنت ہے:

> اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔[۴۳]

اقبال سرمایہ داری کے حوالے سے جس حد اعتدال کی بات کر رہے ہیں وہ اسلام کا جو سرمایہ کے متعلق نظریہ ہے اسی کی جانب اشارہ ہے۔اسلام حق ملکیت کا قائل ہے اور سرمایہ کو بھی خاصی اہمیت دیتا ہے مگر اسلامی اقتصادی نظام ایک اعتدال پر مشتمل ہے جہاں سرمایے کے احتکار اور' قارونی ارتکاز' کی کوئی گنجائش نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس احتکار و ارتکاز مغربی سرمایہ داری کا اصل الاصول ہے۔اسلامی اقتصاد زکواۃ اور دیگر اس جیسے قوانین کا حامل ہیں جن کی رو سے مازاد سرمایہ (Surplus) اور دولت کو معاشرے کے محتاج طبقے میں مساوی طور پر تقسیم کیا جاتا ہے جس سے معاشی سطح پر اجتماع میں ایک اعتدال و توازن قائم رہتا ہے۔ مزید یہ کہ اسلام اپنے معیشتی اصولوں کے پیش نظر سرمایہ اور سرمایہ دار سے زیادہ اہمیت مزدور کو دیتا ہے جسے وہ پیداوار اور تولید کا اصلی عامل مان کر' حبیب خدا' ہونے کے اعزاز سے نوازتا ہے مگر سرمایہ دارانہ نظام مزدور کو اپنی تولیدی صنعت کا ایک پرزہ مان کر اسے ایک نامعقول اجرت کے عوض خریدتا ہے جسے ایک طرح کی بیگاری کی رقم بھی کہہ سکتے ہیں۔ بقول شہید مطہری:

> نئے سرمایہ داری نظام (یعنی کیپٹلیزم) اور قدیم سرمایہ داری میں اور بطریق اولیٰ سوشلزم میں اصلی فرق یہ ہے کہ سرمایہ دار کاریگر کے کام کی قوت کو بیچنے

کے لیے خریدتا ہے نہ یہ کہ خود اسے اس قوت کی ضرورت ہے ،کام کی اس قوت سے اضافی قیمت ایجاد کرتا ہے۔اضافی قیمت جو کاریگر کی کام کی قوت کا نتیجہ ہے اور فطری طور پر اسی سے متعلق ہے یہ وہی فائدہ ہے جو کار فرما حاکم کو حاصل ہوتا ہے اسی بنا پر کہتے ہیں کہ نیا سرمایہ داری نظام دراصل کاریگر کا خون چوسنا ہے۔[۴۴]

سرمایہ دار و سرمایہ دارانہ نظام ایک مخصوص مغرضانہ پالیسی کے تحت مزدور کا استحصال کرتے ہیں یہ ایسے اصول وضع کرتے ہیں جن سے مزدور کو کم سے کم منافع حاصل ہونے کا امکان رہتا ہے۔ نتیجتاً مزدور اپنے جائز حقوق سے محروم ہو کر دن بہ دن فقر و افلاس سے دوچار ہوتا ہے اور بالآخر اسے کوڑیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔بقول اقبال :

بندہ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہوں پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات[۴۵]

(سرمایہ ومحنت)

مزدور و کارگر کو خواستہ ناخواستہ سرمایہ داری سے پیدا شدہ حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے اسے اپنے آپ کو سرمایہ دار و سرمایہ داری کی ابلیسی خواہشات کی بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے۔اقبال نے سرمایہ داری کی عیاریوں و مکاریوں کو اپنی نظم ''قسمت نامہ سرمایہ دار'' میں بڑے دلچسپ اور فکر انگیز انداز میں بیاں کیا ہے جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے :

غوغاے کارخانہ آہنگری زمن
گلبانگ ارغنون کلیسا ازان تو

(ترجمہ: سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ فولاد اور لوہے کے شور شرابے والے کارخانے میری ملکیت ہے جبکہ کلیسا کے سرور و نغمے تیری ملکیت ہے۔)

نخلی کہ شہ خراج برو می نہد ز من
باغ بہشت و سدرہ و طوبا ازان تو

(ترجمہ: وہ درخت خرما جس پر حکومت کی طرف سے ٹیکس عائد ہوتا ہے وہ میری ملکیت ہے جبکہ باغ بہشت اور سدرہ وطوبا تیری ملکیت ہیں۔)

تلخابہ کہ درد سر آرد ازان من
صہباے پاک آدم و حوا ازان تو

(ترجمہ: دنیا کی یہ شراب جس سے درد سر ہوتا ہے میری ملکیت ہے اس کے برعکس شراب ناب یعنی دنیا کا شیریں پانی جو آدم وحوا کا مرغوب شربت ہے تیری ملکیت رہے۔)

ایں خاک و آنچہ در شکم او ازان من
وز خاک تابہ عرش معلا ازان تو[۴۶]

(ترجمہ: یہ زمیں اور جو اس کے بطن میں ہے میری ملکیت ہے اور زمین سے لے کر آسمان ہی نہیں بلکہ عرش بریں تک ساری کائنات تیری ہے۔)

اقبال نے مذکورہ بالا فکر انگیز اشعار میں سرمایہ داروں کی قارونی نفسیات اور مزدوروں کی معصومانہ و سادہ لوحانہ نفسیات کی بڑی دلکش منظر کشی کی ہے، وہ محنت کشوں کے واقعی بڑے حامیوں میں سے تھے اور وہ بھی اتنے بڑے حامی کہ ایسا لگ رہا ہے کہ مزدوروں و محنت کشوں کی حمایت میں دنیا کے کوئی بڑے کمیونسٹ رہنما اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے بقول ایک سرمایہ دار کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ نا کردہ سعی کا پھل کھائے:

کارخانے کا ہے مالک مردک نا کردہ کار
عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے نا سازگار

حکم حق ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار[۴۷]

اقبال کی نظر میں ایک تن آساں اور عیش کوش سرمایہ دار اگر ایک محنت کش کی نظر میں ایک چور و ڈکیٹی جیسا ہے تو وہ حق بہ جانب ہے :

بدوش زمیں بار سرمایہ دار
ندارد گذشت از خور و خواب و کار

(ترجمہ:محنت کش کے بقول سرمایہ دار کا وجود زمین کے دوش پر ایک بار کے مترادف ہے کیونکہ یہ نکما کھانے پینے اورسونے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتا ہے۔)

جہان راست بہروزی از دست مزد
ندانی کہ ان ہیچ کار است دزد[۴۸]

(مرد مزدور)

(ترجمہ:اور دنیا میں جو آبادی و عمرانی ہے وہ صرف مزدور کی وجہ سے ہے اس کے برعکس چور لٹیرا سرمایہ دار کسی رونق کا باعث نہیں۔)

سرمایہ دارانہ نظام نے اقتصادی فقر و افلاس کے علاوہ آج کے انسان کے لیے اور دوسری مشکلات کو کھڑا کر دیا اور انسانی معاشرے میں جو پہلے سے موجود بڑے گھمبیر مسائل تھے انہیں اس نے اور زیادہ بحرانی بنایا۔نسل پرستی اجتماعی سطح پر صدیوں سے انسانی معاشروں میں موجود رہی ہے اور ایک منظّم پروپیگنڈے کے تحت دنیا کو یہ باور کرایا جارہا ہے کہ سرمایہ داری نے اس حوالے سے ایک مثبت رول ادا کرکے نسل پرستی کے رجحان کو کافی حد تک ختم کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔مگر جب صورتحال کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے،کیونکہ نسل پرستی سرمایہ داری و آزاد معیشت کے فروغ سے کم یا ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کو ان سے اور فروغ ملا مزید یہ کہ نسل پرستی نے اور زیادہ پیچیدہ صورتیں اختیار کی۔آزاد معیشت کو دن دوگنی اور رات چگنی ترقی اور زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کے لیے کارخانوں اور فیکٹریوں میں سستے سے سستے مزدوروں کی ضرورت تھی اس کی خاطر مغربی سرمایہ داروں نے ایسے لوگوں کو مزدوری پر لیا

جو ان کی نظر میں نسلی اعتبار سے فرومایہ تھے مثلاً سیاہ فام وغیرہ ۔ اتنا ہی نہیں خود مغربی دنیا میں ایسی کچھ ذاتیں پائی جاتی ہیں جو سفید فام لوگوں کی نظر میں نچلی ذات کے لوگ تصور کیے جاتے ہیں ۔ان سب کے ساتھ سرمایہ دار امتیازی سلوک روا رکھ کر انہیں سفید فام مزدوروں اور کارکنوں سے بہت کم اجرت دیتے ہیں۔ یہ امتیازی سلوک صرف نسلی اعتبار سے روا رکھا جاتا ہے اور اس کے پیچھے سرمایہ داروں کا یہ مذموم مقصد چھپا ہوا ہے کہ اس طرح ایک نسلی طبقاتیت قائم کر کے ذرائع پیداوار و تولید میں زیادہ سے زیادہ اضافے کے لیے انتہائی سستے داموں پوری دنیا سے مزدور فراہم کیے جا سکیں۔انیا لومبا اس حقیقت سے کہ سرمایہ داری نسل پرستی کو فروغ دینے میں بڑی کوشاں رہی ہے یوں پردہ ہٹاتی ہے:

> Capitalism therefore does not override and liquidate racial hierarchies but continues to depend upon, and intensify them. Ideologies of race and the social structures created by them facilitate capitalist production.[۴۹]

نسلی طبقاتیت اور نسل پرستی کو فروغ دینے کے علاوہ سرمایہ داری نے بشر کو اس کے بنیادی انسانی اوصاف سے ہی محروم کر دیا۔ترحم اور ہم زیستی کے جیسے انسانی خصائل کا خاتمہ کر کے اس نے سفاکی و بے رحمی کو خوب فروغ دیا۔ بقول مولانا مودودی:

> جدید سرمایہ داری کی بنیادوں پر جو نیا معاشرہ وجود میں آیا وہ ہمدردی، تعاون ،رحم ، شفقت اور اس نوع کے تمام جذبات سے عاری اور اس کے برعکس صفات سے لبریز تھا۔اس نظام میں غیر تو غیر بھائی پر بھائی کا یہ حق نہ رہا کہ وہ اسے سہارا دے۔ [۵۰]

سودی کاروبار پر مبنی آزاد معیشت اور سرمایہ داری نے سب سے مہلک ضرب جس چیز کو لگائی وہ دین و مذہب اور اخلاقی اقدار تھیں۔ مذہب اور مذہبی عقائد و اقدار کی جتنی تضعیف ایک منصوبہ بند طریقے سے سرمایہ داری نے کی شائد ہی کسی دوسری چیز کی کی ہو۔اخلاقی اصول و

قوانین کی دھجیاں اڑا کر اور دینی آداب وسنن کی تاراجی کر کے سرمایہ داری نے انسان کو ایک اخلاقی انارکی میں مبتلا کر دیا جو اپنے خوف ناک روحانی ونفسیاتی اثرات کے ساتھ ایک گھن کی طرح معاشروں کو چاٹ رہی ہے۔ ایک آزاد اور بلا روک ٹوک تجارت کے لیے سرمایہ داری کے راستے میں مذہبی تعلیمات ہی ایک سد راہ کے طور پر حائل تھیں کیونکہ مذہبی قوانین(اسلامی قوانین) جائز و نا جائز اور حق و باطل کی فطری تمیز پر مبنی ہونے کی وجہ سے غیر اخلاقی امور کو کارو بار میں قبول نہیں کرتے ہیں۔ اسی چیز کو مدنظر رکھ کر نظام سرمایہ داری نے اپنی اولین فرصت میں مذہب اور مذہبی تعلیم و اقدار کو انسانی معاشرے سے بے دخل کرنے کی سر توڑ کوششیں کیں اور ان کوششوں میں افسوس کے ساتھ وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اس کامیابی کو پانے کی خاطر جس حربے کو سب سے زیادہ آزمایا گیا وہ شہوات اور شہوانیت کو بڑے عظیم پیمانے پر فروغ دینے کا تھا اور شہوانیت کو فروغ دینے کے لیے جو سب سے نازک اور حساس ہونے کے علاوہ انتہائی موثر آلہ تھا وہ عورت کی ذات تھی۔ ابلیس روز اول ہی سے آدم وحوا کے لباس کے پیچھے پڑا تھا اور جب تک اس نے اپنی نیرنگ بازیوں سے یہ لباس ان سے نہ چھینا تب تک وہ چین سے نہیں بیٹھا۔ چناں چہ اس کی اتباع میں آج اس کے ان سرمایا دار چیلوں نے بھی وہی لباس عورت سے چھین کر اس کی کرامت وشخصیت کو اپنی بوالہوسی کے خاطر شرمناک طریقے سے ضائع کر دیا تا کہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ ہاتھ آجائے۔ بقول مولانا مودودی:

> بغیٰ اور عدوان کے اس ناپاک دور میں غیر ممکن تھا کہ خودغرض افراد کی نظر انسان کی اس بڑی اور شدید ترین کمزوری -شہوانیت - پر نہ پڑتی جس کو بھڑکا کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔ چناں چہ اس سے بھی کام لیا گیا اور اتنا لیا گیا جتنا لینا ممکن تھا۔ تھیٹروں میں ، رقص گاہوں میں اور فلم سازی کے مرکزوں میں سارے کارو بار کا مدار ہی اس پر قرار پایا کہ خوبصورت عورتوں کی خدمات حاصل کی جائیں، ان کو زیادہ سے زیادہ برہنہ اور زیادہ

سے زیادہ ہیجان انگیز صورت میں منظر عام پر پیش کیا جائے، اور اس طرح
لوگوں کی شہوانی پیاس کو زیادہ سے زیادہ بھڑکا کر ان کی جیبوں پر بھی ڈاکہ
ڈالا جائے۔ [۵۱]

اقبال نے اپنی شاہکار نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس سے اسی لیے کہلوایا تھا کہ:

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں [۵۲]

یہ سرمایہ داری کا جنوں ہی ہے جس سے آج انسانیت بحران کا شکار اور تباہی و نابودی کے کگار پر کھڑی ہے۔

نظام سرمایہ داری میں جہاں معیشت و اقتصاد کے بنیادی اصول و ارکان فردی مالکیت، ثروت و مالکیت میں افراد کے اختلاف کا طبیعی ہونا ،سود کے ذریعے وسائل کا مالک ہونا اور مزدور کو خرید کر اس کا استحصال کرنا وغیرہ ہیں وہیں اشتراکیت پیداواری وسائل کی نجی ملکیت و موروثی مالکیت سے انکار، مزدور کی حکمرانی ،طبقاتی تفاوت کی نفی اور اجتماعی مالکیت کے اصولوں پر استوار تھی۔اشتراکیت دراصل سرمایہ داری کے ظالمانہ اورغیر عادلانہ نظام کے خلاف ایک طبیعی ردعمل تھا۔جب دیکھتے ہیں تو سرمایہ دار معاشرے کے ایک فیصد افراد کوتشکیل دیتے ہیں مگر ننانوے فیصد لوگوں کی دولت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک فطری امر ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشروں میں اقتصادی نابرابری اور عدم مساوات کا دور دورہ ہو،اقتصادی نابرابری اور عدم مساوات کے اس ظالمانہ چنگل میں سوسائٹی کے جس طبقے کی اسیری سب سے زیادہ نا قابل قبول ہونے کے ساتھ بڑی ناگفتہ بہ رہی ہے وہ مزدوروں کا طبقہ ہیں۔بالآخر یہ مزدور ہی ہے جس کے خون پسینے سے ایک سماج اور سرمایہ دار کی دنیا میں رونق ہوتی ہے۔مزدور کی محنت و مشقت اور اس کی جانفشانی ہی پیداوار اور تولید کی ضامن ہوتی ہے۔مزدور کی تگ و دو سے پیداواری ذرائع میں ترقی اور افزائش ہوتی ہیں تو نتیجے میں ملکی زر مبادلہ میں اضافہ ہوتا ہے جو ایک ملک کوثروت مند اور خوشحال بنانے میں ایک اہم عامل شمار ہوتا ہے مگر نہایت تاسف کی بات ہے کہ

یہی مزدور جو ہرطرح کی اقتصادی و معاشی رونق و چہل پہل کا بنیادی سبب ہے کسمپرسی کی حالت زار میں سرمایہ دارانہ نظام میں زندگی بسر کر رہا ہے جس کا ذمے دار بنیادی طور پر سرمایہ دار ہے۔ اقبال نے سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی کشاکش کو اپنی نظم ''نوائے مزدور'' میں پیش کیا ہے جہاں مرد مزدور سرمایہ دار سے کہہ رہا ہے کہ میں اپنے خون اور پسینے سے ہر نعمت کا باعث ہوں مگر میں محروم ہوں اور تم متمتع :

زمزد بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیب خواجہ ناکردہ کار رخت حریر

(ترجمہ: مزدور کہتا ہے میں خود ٹاٹ پہنتا ہوں اور میری جفاکشی کی بدولت خواجہ (سرمایہ دار) جو ہاتھ پاؤں تک نہیں ہلاتا ہے ریشم وحریر زیب تن کرتا ہے۔)

ز خوے فشانی من لعل خاتم والی
ز اشک کودک من گوہرستام امیر

(ترجمہ:مزدور جانفشانی کے ساتھ کانیں کھودتا ہے اور امیر اپنے ہاتھ میں طرح طرح کی انگوٹھیاں پہنتا ہیں جو مختلف نگینوں سے جڑی ہوتی ہے ،یہ مزدور کے بچوں کے آنسوں ہوتے ہیں جن سے امیر کی لعل و گوہر کی انگوٹھیاں چجتی ہیں۔)

خرابہ رشک گلستاں ز گریہ سحرم
شباب لالہ و گل از طراوت جگرم[۵۳]

(ترجمہ: میرے آنسوؤں سے (مشقت سے)ویران اور بنجر زمینیں رشکِ گلستاں بنی میری ہی جانفشانی اور میرے جگر کے ٹکڑوں سے لالہ و گل (اقتصاد و سرمایہ) میں طراوت و تازگی ہے۔)

مزدوروں کی حالت زار اور طبقاتیت پر مبنی معاشی نابرابری کے خلاف انیسویں صدی میں کارل مارکس اٹھ کھڑے ہوے ۔انہوں نے سرمایہ داری کے برخلاف مزدوروں اور دیگر پچھڑے ہوے طبقات کے حق میں اشتراکیت پر مبنی نظریہ پیش کیا، جس کے مطابق سرمایہ داری اور اس کے دیگر متعلقات جیسے نجی ملکیت وغیرہ بنیادی طور پر اقتصادی مشکلات و بحران کا باعث

ہیں۔ یہ سرمایہ داروں کی زر اندوزی اور لوٹ کھسوٹ ہے جو محنت کشوں کے استحصال کو عملی جامہ پہناتی ہے ۔نجی و ذاتی ملکیت کا حق اور سود خوری سرمایہ داروں کے لیے یہ موقعہ فراہم کرتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت کو سمیٹیں اس لیے اگر معاشی برابری اور مساوات کو قائم کرنا ہے تو پہلے ان چیزوں کا خاتمہ کرنا ہوگا۔اسی بنا پر اشتراکی نظام نے تمام قومی سرمایے اور دولت کو عوامی ملکیت میں دے دیا تا کہ اس دولت پر سب لوگوں کا حق مساوی ہواور مزدور خصوصی طور پر اس دولت و ثروت کے مالک قرار پایے۔ ان نظریات کے تحت کارل مارکس نے دنیا کے تمام محنت کشوں کو نظام سرمایہ داری کے خلاف قیام کرنے پر ابھارا اور ۱۹۱۷ء میں روس میں اس تحریک نے زار روس اور اس کے آمرانہ و سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف قیام کر کے اس کا تختہ پلٹ کر دنیا کا پہلا اشتراکی انقلاب بپا کیا۔اس انقلاب کا بنیادی ہدف معاشی مساوات کو قائم کرنا ، دولت کی مساوی تقسیم اور آمریت کا خاتمہ تھا۔اقبال کے نقطۂ نظر سے دنیا میں معاشی و معاشرتی مساوات قائم کرنا ایک مستحسن فعل ہے جو اسلام کا بھی اصلی مقصد ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر میں اشراکیت کے معاشی و معاشرتی مساوات پر مبنی نظریات اشتراکیت کے مثبت و ایجابی پہلو تھے۔اشتراکی رہنماؤں اور نظریہ پردازوں جیسے مارکس وانیجلز وغیرہ کی طرح اقبال بھی دنیا کے ستم دیدہ عوام سے کہہ رہے ہیں کہ اٹھو اورظالم سرمایہ دارانہ نظام کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکو۔اشتراکیت سے دنیا میں جوایک امیدافزا فضا ہرطرح کے ظالمانہ نظام کے خاتمے اور بر اندازی کے حوالے سے قائم ہوئی اقبال اس کو مدنظر رکھ کر محنت کشوں کو ہر نوعیت کے ظالمانہ و آمرانہ نظام کے خاتمے پر اکسا کر انہیں ایک نئے دنیا کے قیام کی تلقین کرتے ہیں ۔نظم ''نوائے مزدور' 'میں مزدور دنیا کے تمام محنت کشوں کواتحاد و وحدت کی دعوت دیتا ہے کہ آو قیام کرکے اپنی دنیا آپ آباد کریں:

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگ ساز

مے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم

(ترجمہ: آجا(مردمزدور) سن کہ کائنات کے ساز سے نیا نغمہ نکل رہا ہے (اشتراکیت کا نظام)
جس شراب سے پیالہ پگھل جاتا ہے(اشتراکیت سے) اسے پیالے میں انڈیل دیتے ہیں ۔)

مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم
بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم

(ترجمہ: آ و مغان اور دیر مغاں کو نئے سرے سے آباد کرتے ہیں یعنی ایک عدل و مساوات پر مبنی دنیا قائم کرتے ہیں اور پرانے میکدوں (ظالم نظام یعنی سرمایہ داری وغیرہ) کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔)

زرہزنانِ چمن انتقام لالہ کشیم
بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم[54]

(ترجمہ: اب بہت سازگار وقت ہے کہ رہزنوں (آمروں اور سرمایہ داروں وغیرہ) سے ان کے کیے کا بدلہ لے کر ان کا خاتمہ کریں اور اس طرح ایک نئی دنیا آباد کریں۔)

اشتراکیت کے معاشی و معاشرت کے متعلق اصول و نظریات اقبال کی نظر میں اسلام کے معاشی و معاشرتی اصول ونظریات کے ساتھ کافی ہم آہنگی رکھتے تھے اور ان کے نقطۂ نظر سے دنیا غیر شعوری طور پر دھیرے دھیرے اسلام کی حیات بخش تعلیمات کی جانب خود بخود آرہی تھی۔جس حقیقت اور جن اسلامی حقائق کو صدیوں تک استکبار نے دنیا سے چھپائے رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی وہ حقیقت اب کھل کر سامنے آرہی تھی۔رحم و انصاف ، عدل و مساوات اور بذل و بخشش اسلامی تعلیمات کا لب لباب ہیں اور استکبار و استثمار کی نفی ان تعلیمات کی روح ہیں۔ چناں چہ اقبال کے مطابق اشراکیت سے ان مذکورہ تعلیمات کی بو باس آرہی تھیں۔نظم ''اشتراکیت'' میں وہ یوں اس معاملے کے حوالے سے لب کشائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمی رفتار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

جو حرف ”قل العفو“میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار[۵۵]

اشتراکیت کے نظام عدل و مساوات کو دیکھ کر استکباری نظام ،نظام سرمایہ داری اور بالخصوص دنیا کی آمرانہ حکومتیں ڈر گئیں کہ مبادا ہمارا خاتمہ اشتراکیت کے ہاتھوں انجام پائیں۔یہ سبھی نظام جس طبقے کے ہاتھ میں تھے وہ بورژوا (Bourgeois) کا تھا جو عوام کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے کہ کہیں رکھیں اورکہیں اپنے مذموم مقاصد کی خاطر قربان کر دیں۔ جہاں اشتراکیت سے عوام کو کسی حد تک عرفان جہاں حاصل ہوا وہیں وہ آگہی ذات سے بھی ایک معتدبہ انداز میں سرفراز ہوئے۔بیداری و ہوشیاری کی اس عظیم انقلابی لہر سے تمام استکباری نظام لرزہ براندام ہوئے، استکبار جس نفسیاتی کشمکش کا شکار اشتراکیت کےظہور سے ہوا اقبال نے اس کی منظر کشی ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ میں اپنے موقلم سے بڑے فنکارانہ انداز میں کی ہے۔ابلیس کے مشیرابلیس کوگزارش پیش کر رہے ہیں کہ اشتراکیت کے ظہور سے ہمارے سبھی نظامات اور ہتھکنڈے ناکارہ ہونے کو ہیں جن میں سرمایہ داری وغیرہ سرفہرست ہیں:

وہ کلیم بے تجلی! وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق ومغرب کی قوموں کے لیے روز حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب
وہ یہودی فتنہ گر ،وہ روح مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار

فتنہ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار ومرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر وزبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار [۵۶]

اقبال کے اشتراکیت سے متعلق اس پر جوش لب و لہجے کو دیکھ کر بہت سے لوگ اس التباس کے شکار ہوگیے کہ شاید اقبال بھی اشتراکی یا بالشویک ہے جس کی وہ بڑے پرزورالفاظ میں تردید کرتے ہیں۔ان کی نظر میں معاشی و معاشرتی مساوات کے عادلانہ اصول اشتراکیت کے مثبت نکات ہیں جو اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہیں اسی سبب سے وہ اشتراکیت کی کچھ حد تک تائید کرتے نظر آتے ہیں ۔یہاں پر یہ نکتہ واضح رہے کہ اقبال کی رو سے اشتراکیت کا جو سب سے بڑا منفی نکتہ اورسقم ہوتا ہے وہ اس کا نفی دین و اخلاق کا نظریہ ہے،جسکی خاطر وہ اس بات کی بڑی سختی کے ساتھ تردید کرتے ہیں کہ وہ فکری طور پراشتراکی خیالات کے ساتھ کلی نوعیت کی مفاہمت رکھتے ہیں۔اس کے برعکس وہ ان خیالات ونظریات کو رکھنا دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف قرار دیتے ہیں ۔اس بابت وہ اخبار''زمیندار'' کے ایڈیٹر کے نام اپنے ایک تفصیلی خط میں لکھتے ہیں:

میں نے ابھی ایک دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بالشویک خیالات منسوب کیے ہیں ۔چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہوجانے کے مترادف ہے۔اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے ۔میں مسلمان ہوں ۔میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری

> کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جاے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کردیا جائے۔جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں ۔قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث ،حرمت ربا اور زکٰوۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے۔ اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط وتفریط کا نتیجہ ہے۔[۵۷]

بالشویک وجود باری ، دین اور ہدف و مقصد خلقت کے متعلق جو خیالات و نظریات رکھتے تھے اقبال انہیں اشتراکیت کا ابلیسی رخ اور ابلیسی پہلو قرار دیتے ہیں ۔کارل مارکس اور دیگر مارکسی مفکرین نے صرف اقتصاد ومعیشت کے متعلق ہی ایک دستور ونظریہ نہ دیا بلکہ انہوں نے اس ساری کائنات اور بالخصوص وجود باری و انسان کے متعلق ایک ایسا نظریہ قائم کیا جو سراسر مادی تعبیر و نقطۂ نظر پر مشتمل تھا۔ چونکہ اشتراکی قطعی طور پر مادہ پرستانہ ذہنیت کے حامل تھے اسی مادہ پرستانہ ذہنیت کے تحت انہوں نے تاریخ کے متعلق بالکل ایک مادی نقطۂ نظر قائم کیا جو جدلیاتی مادیت(Dialectical Materialsim) کے نام سے موسوم ہے۔جدلیاتی مادیت کی رو سے یہ کائنات عناصر و سالمات کی ایک غیر شعوری ترکیب سے خود بخود وجود میں آ گئی۔مزید برآں اس ہستی کا کوئی خالق نہیں ہے ،یہ زندگی کسی عالی ہدف و مقصد کی بالقوہ مالک نہیں ہے اور انسانی شعور کلی طور پر مادی ماہیت رکھتا ہے جس میں روح و وجدان کا کوئی عمل دخل نہیں ہیں اس کے علاوہ حقیقت و واقعیت بس وہی کچھ ہے جس کا ادراک ہمارے حواس خمسہ کرتے ہیں۔جو چیزیں ہمارے حواس کی گرفت میں نہیں آتی وہ چیزیں توہمات وخرافات اور ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔مجموعی طور پر مارکسی و اشتراکی مفکرین دین و دینی مفاہیم کو

انسان و انسانیت کے لیے ایک افیون قرار دیتے ہیں۔محمد قطب اشتراکیت کی مادہ گرائی کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

> پہلی بات تو یہ ہے کہ اشتراکیت ایک خالص مادہ پرستانہ نظریہ ہے۔ اور اس کے نزدیک حقیقت بس وہی کچھ ہے جس کو ہم حواس خمسہ کے ذریعے معلوم کر سکیں۔ جو حقائق ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہیں وہ توہمات اور خرافات کا پلندہ ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔اس لیے ان کے متعلق انسان کو کسی قسم کا تردد کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انجلز(Engels) نے لکھا تھا'' مادہ ہی زندگی کی واحد حقیقت ہے''۔ اسی طرح ان مادہ پرستوں کا یہ بھی خیال ہے کہ'' انسانی ذہن مادے ہی کا ایک مظہر ہے اور اپنے گرد و پیش کے بیرونی مادی مادوں کا عکس'' ان کے خیال میں انسانی روح کی بھی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ خالص مادی حالت کی پیداوار ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ اشتراکیت ایک خالص مادہ پرستانہ نظریہ ہے جس کے نزدیک انسانی زندگی کے تمام روحانی مظاہر سامان تمسخر اور غیر معقول (غیر سائیٹفک) نظریات اور خیالات کا نتیجہ ہیں۔[۵۸]

جدلیاتی مادیت انسان کی زندگی اور اس کے ارتقا کو مادی کشمکش کا نتیجہ مانتی ہے اور اجتماعی حیات میں جتنے بھی طبقات ہیں وہ انہیں اسی مادی کشمکش اور عمل و ردعمل کے ایک پیچیدہ سلسلے کی پیداوار ٹھہراتی ہیں۔دنیا کے بڑے بڑے مصلحین و روحانی پیشوا حتیٰ کہ انبیاو مرسلین جو انسانوں کے ایک طبقے کو تشکیل دیتے ہیں اشتراکیوں کی مادی جدلیات کی رو سے اسی مادی کشمکش کے عوامل ہیں۔ مزید برآں اس کشمکش کے علاوہ انسان کی زندگی میں جدوجہد اور سعی و عمل کے لحاظ سے اور کوئی برتر ہدف و مقصد نہیں ہے جو انسان کی زندگی کو حرکت و عمل کا انگیزہ بخشے۔ اسی طرح اعلیٰ روحانی و معنوی مقاصد ،ایک مثالی و ابدی زندگی کا اشتراکیت کی نظر میں کوئی وجود نہیں ہے بلکہ حیات انسانی کے تمام مراتب و اہداف انسانی تاریخ کے مادی تفاعل و اضداد کی باہمی

رسا کشی میں منحصر ہیں ،اضدادوں کی باہمی کشمکش ہی انسان کی تمام اقتصادی و مادی ترقی کا اصلی باعث ہیں اور انسانیت کو اپنے ارتقا کے حوالے سے جتنے بھی تاریخی مراحل سے گزرنا پڑا جیسے غلامی ، جاگیرداری و سرمایہ داری وغیرہ اسی مادی کشمکش کا نتیجہ ہے۔مزید یہ کہ اس کشمکش کو جاری رکھتے ہوے انسانیت اپنے آخری ہدف ومقصد تک پہنچ جائے گی جو اشتراکیت سے عبارت ہے اور یہ مرحلہ حیات انسانی کا اپنی مادی ترقی کے حوالے سے آخری مرحلہ ہوگا۔اس مادی و الحادی ذہنیت کو مدِ نظر رکھ کر جو بات سامنے آتی ہے وہ اس پر دال ہے کہ اشتراکیوں کے نزدیک انسان کی زندگی کا کوئی برتر روحانی مقصد نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی کا خلاصہ مادی جدوجہد اور اس جدو جہد کے ساتھ وابستہ امور جیسے روٹی، کپڑا،مکان اور جنسی تلذذ وغیرہ میں ہوتا ہے ۔یوں انسان کی زندگی بالکل ایک حیوان کی زندگی کے مترادف ٹھہرتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ انسان ایک شعور جسے اشتراکی مادی شعور کہتے ہیں کا مالک ہے جبکہ ایک حیوان اس سے عاری ہوتا ہے۔خلیفہ عبدالحکیم اس نقطۂ نظر کو مدنظر رکھ کر اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال اشتراکیت کے تمام پہلوؤں سے اتفاق رکھتے تھے سوائے اس کے کہ اس تمام تنظیم جدید نے انسان کے دل و دماغ پر یہ غلط عقیدہ مسلط کردیاہے کہ تمام زندگی مادی اسباب کی عادلانہ یا مساویانہ تقسیم سے فروغ اور ترقی حاصل کرسکتی ہے۔ علامہ اقبال انسانی زندگی کا مقصود جسمانی ترقی نہیں بلکہ روحانی ترقی سمجھتے تھے ۔روح انسانی آب وگل کی پیداوار نہیں اور اس کے لیے آب وگل میں پھنس کر رہ جانا اسے غایت حیات سے بے گانہ کردیتا ہے۔ [۵۹]

دین و اخلاق منجملہ دینی معارف وحقائق کی تنسیخ کر کے اشتراکیوں نے ایک ایسے سیاسی و اجتماعی نظام کی تشکیل کی جو دینی اقدار اور اخلاقی ضوابط سے یکسر عاری تھا۔ اشتراکی معاشرہ ایک ایسے اخلاقی ضابطے کا مالک تھا جو طبقاتی کشمکش کی پیداوار تھا، یہ اخلاقی ضابطہ طاقت و زور گوئی کے سوا کسی اور چیز کا حامل نہ تھا لینن اس اخلاقی ضابطے کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصور پر مبنی ہو یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو جو طبقاتی تصورات سے ماوراء ہیں ۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے ۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کے لیے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لیے ضروری ہو... ناگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال ،فریب غیر قانونی تدبیر، حیلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے ۔[۶۰]

اقبال کی نظر میں دین انسانی زندگی کی اساس ہے کیونکہ دین ہی کی بدولت انسان کی مجموعی نشونما ممکن ہے ۔جو معاشرے دین سے عاری ہوتے ہیں وہ فطرت کی دوڑ میں شکست و ریخت سے دوچار ہوتے ہیں۔تمام ادیان اور بالخصوص اسلام جو فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے اشتراکیوں کے الحادی افکاراور حملوں کا سب سے زیادہ نشانہ بنا۔ اقبال کی نظر میں اشتراکیوں کا سب سے بڑا نقص دین ستیزی وخدا ستیزی کا تھا جس نے انہیں ابلیس کے خاکی لشکر میں ایک نمایاں صف کے اندر جگہ دی۔ اگر وہ خدا اور دین کے قائل ہوتے تو وہ اسلام کے بالکل قریب اپنے آپ کو پاتے :

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا
سفر خاکی شبستاں سے نہ کرسکتا اگر دانہ
نہاد زندگی میں ابتدا ''لا'' انتہا ''الا''
پیام موت ہے جب ''لا'' ہوا ''الا'' سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی ''لا'' سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو، ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ[۶۱]

(لا و الا)

اشتراکیوں کے قدم لا سے الا کی جانب نہیں بڑھے یعنی انہوں نے استکبار و استثمار جو سرمایہ داری اور دیگر دوسرے نظاموں کی صورت میں انسانیت پر بری طرح مسلط تھے کا خاتمہ کر

کے انسانی مساوات وغیرہ کو قائم کیا جو عین اسلام کے مقاصد عظیمہ میں شامل ہیں مگر افسوس یہ کہ الا یعنی خدا اور دینی مفاہیم کو تسلیم کرنے سے وہ محروم رہے۔ ان کی یہ مذہب دشمنی آخر پر ان کی تباہی و نابودی کا باعث بنی، دینی فطرت کے خلاف جو بھی قیام کرتا ہے وہ صفحۂ ہستی سے منقرض ہوتا ہے اور یہ انقراض اس لیے عمل میں آتا ہے کیونکہ انسان اور اس کی سرشت اسی دینی والوہی فطرت پہ مشتمل ہیں اور اسی فطرت کی جانب انسان شعوری و غیر شعوری طور پر گامزن ہے۔ اقبال امید کرتے تھے کہ شاید اشتراکیوں کے قدم رفتہ رفتہ ایک غیر محسوس انداز میں دینی فطرت کی جانب شاید بڑھ جائے:

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرف لا آمد بروں

(ترجمہ: روس کا دل وجگر خوں ہوا (اشتراکی انقلاب کی وجہ سے) اور اس انقلاب کی بدولت انہوں نے کلمہ لا کہہ کر استکبار کی تنسیخ کردی۔)

آں نظام کہنہ رابرہم زدست
تیز نیشے بررگ عالم زد است

(ترجمہ: اشتراکیوں نے پرانے استکباری نظام کو درہم برہم کر کے مساوات پر مبنی نیا نظام قائم کیا انکے اس انقلاب سے پورا عالم حرکت میں آگیا ہے کہ اس استکبار کا قلع قمع کرتے ہیں۔)

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لاسلاطیں، لاکلیسا، لا الٰہ

(ترجمہ: میں نے اس انقلاب کی ماہیت پر غور کیا تو مجھے یہ تین بنیادوں پر استوار نظر آیا وہ تین چیزیں یہ ہیں کہ نہ آمریت، نہ کلیسا اور نہ ہی خدا۔)

فکر او در تند باد لا بماند
مرکب خود را سوئے الا نراند

(ترجمہ: اشتراکی لا کے طوفانی دنیا میں محبوس ہو کر رہ گیے، انہوں نے اپنی انقلابی فکر کے

رہوار کو الا کے افلاک کے جانب نہ دوڑایا۔)

آیدش روزے کہ از زور جنوں
خویش را ازیں تند باد آرد بروں

(ترجمہ:ایک روز آیے گا جب جنوں یعنی حق شناسی اورحقیقت طلبی کے فطری شوق سے اس محبوس فضا سے نجات پائیں گے۔)

درمقام لا نیا ساید حیات
سوے الا می خرامد کائنات

(ترجمہ:انسانی حیات صرف لا ہی کے کلمے سے آرام نہیں پاتی بلکہ اسے سکون وطمانیت الا یعنی اثبات کے نغمے کوسن کر ملتا ہے کیونکہ یہ ساری کائنات اسی الا کے پیچھے اپنا سفر شوق طے کر رہی ہے۔)

لا و الا ساز و برگ امتاں
نفی بے اثبات مرگ امتاں[۶۲]

(لاالٰہ الااللہ)

(ترجمہ: کلمہ لا و الا سے امتوں کی حیات کے شجر برگ و بار لاتے ہیں۔نفی و اثبات کے بغیر امتوں کی حیات کا خاتمہ ہوتا ہے۔)

اقبال کارل مارکس اور اشتراکیوں کی الحادی فکر، مادہ پرستانہ سوچ اور تنگ نظری کو اپنی شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہیں وہ مارکس کی فکر کو الوہی افکار کے فقدان کے باعث تہی دست اور بے وقعت قرار دیتے ہیں ۔علاوہ بریں وہ مارکس کو ایک طنزیہ پیرائے میں'' پیغمبری بے جبرئیل' کے بلیغ عنوان سے خطاب کرتے ہیں جو اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ مارکس کی تعلیمات میں بہت کچھ مثبت نکات تھے مگر بس ایک خدا اور دین کے لئے کوئی جگہ نہ تھی:

صاحب سرمایہ از نسل خلیل
یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل

(ترجمہ: صاحب سرمایہ (کارل مارکس کی کتاب سرمایہDas Capital کی جانب اشارہ

ہے) وہ خلیل کی نسل میں سے (اشارہ ہے کارل مارکس کے یہودی ہونے کی جانب) یعنی وہ بلا وحی پیغمبر۔)

زانکہ حق وباطل او مضمر است

'قلب او مومن دماغش کافر است'

(ترجمہ: اس کی تعلیمات اگر چہ باطل ہے مگر ان تعلیمات میں حق وصداقت کا ایک عنصر بھی موجود تھا جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دماغ کافر مگر دل مومن تھا۔)

دین آں پیغمبر حق ناشناس

برمساوات شکم دارد اساس

(ترجمہ: مارکس حق ناشناس کا دین مساوات شکم یعنی دولت کے مساویانہ تقسیم پر منحصر تھا۔)

تا اخوت را مقام اندر دل است

بیخ او در دل نہ در آب و گل است![۶۳]

(اشتراکیت وملوکیت)

(ترجمہ: جبکہ مساوات تو اخوت پر منحصر ہے اور اخوت کا مقام دل یعنی ایمان ہے نہ کہ شکم محض دولت کی عادلانہ و مساویانہ تقسیم سے مساوات قائم نہیں ہو سکتا ہے۔مساوات کے قیام کے لیے خدا پر ایمان ناگزیر ہے۔)

اقبال اشتراکیت کو ان مثبت تعلیمات اور خوبیوں کے باوصف حق ناشناس ٹھہراتے ہیں ۔ یہ حق ناشناسی اس کی یزدان ناشناسی ، الحاد و بے دینی اور حقیقت جوئی و حقیقت طلبی کے فقدان سے عبارت تھی جو بنی نوع انسان کو ملوکیت کی طرح اپنی فریب کاری اور تزویر و ترہیب کا شکار بناتی ہے بقول اقبال:

ہر دورا جاں ناصبور و ناشکیب

ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب!

(ترجمہ:اشتراکیت وملوکیت دونوں روح سے بیزار اور اس کے دشمن ہیں اور دونوں انسان کو فریب میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ خدا کے منکر بنو کیونکہ اس جہاں کا کوئی خالق نہیں ہے۔)

غرق دیدم ہر دورا در آب وگل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل![64]

(اشتراک وملوکیت)

(ترجمہ:اشتراکیت و ملوکیت مادہ پرستی میں مبتلا ہے ان دونوں نظاموں میں انسان جسمانی نعمات سے لطف اندوز ہوتا ہے مگر وہ ایمان والٰہی فیوضات سے محروم ہوجاتا ہے۔)

اپنی بقا اور تحفظ کے لیے اشتراکیت کو جس حیات بخش جرعے کی ضرورت تھی وہ دین کے پاس مہیا تھا مگر اس نے قوت و طاقت کے اس عظیم سرچشمے کے ریشے ہی خشک کر ڈالے جس کے سبب وہ نوعمری ہی میں اپنی حیات سے ہاتھ دھوبیٹھی۔ بقول اقبال اگر اشتراکیت دین ستیز نہ ہوتی تو اس کا مطمحِ نظر اور جوش وسرگرمی کا عالم کسی نئے مذہب سے کم نہ تھا:

> مذہب ہی وہ ذریعہ ہے جس سے افکار و خیالات کی دنیا میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور جس کے سہارے ہم زندگی ،قوت اور طاقت کے دائمی سرچشمے تک پہنچتے ہیں ... عصر حاضر کی لا دین اشتراکیت کا مطمحِ نظر بے شک نسبتاً زیادہ وسیع ہے اور اس کے جوش وسرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل کے مخالف نظر متبعین پر ہے لہٰذا وہ اس چیز ہی سے برسر پیکار ہے جو اس کے لیے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی۔[65]

دین کے خلاف برسر پیکار رہ کر آخر کار اشتراکیت کے الحادی ابلیسی نظام کا خاتمہ ایک عبرتناک انداز میں ۱۹۹۱ء میں سابقہ سوویت یونین کے سقوط کی صورت میں ہوا۔ یوں یہ تحریک و انقلاب تقریباً سو سال کے عرصے میں ہی دم توڑ بیٹھا۔ یہ تحریک جتنی نہ سرمایہ داری کے مقابلے میں دھیرے دھیرے ضعیف ہوئی اس سے زیادہ اپنے الحادی نظام حیات کی بدولت شکست و ریخت سے دوچار ہوئی،اپنے اس الحادی نظام کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اشتراکیوں نے اپنے عوام پر بڑے سخت ظلم وستم ڈھائے اور مسلمان ان کی وحشت و بربریت کا خاص طور پر

شکار ہوئے۔ مسلمانوں کو سابقہ سوویت یونین کے اندر تہہ تیغ کیا گیا ان کے مذہبی شعائر پر سر کاری سطح پر پابندی عائد کی گئی اور ان کے مذہبی مراکز جیسے مسجدیں وغیرہ فسق و فجور کے اڑوں تھیٹروں وقحبہ خانوں میں تبدیل کر دے گیے۔اگر اشتراکیت کا عملی طور پر اس وقت تقریباً پوری دنیا سے خاتمہ ہو چکا ہے مگر فکری سطح پر اب بھی دنیا میں اس کے الحادی وابلیسی افکار کی گونج سنائی دیتی ہے، یہ گونج خصوصیت کے ساتھ مادہ پرستی اور لادین سیاست کی صورت میں اس وقت پوری دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔

سیکولرازم اور سیکولر افکار کی اساس مادہ پرستی پر ہے ۔ان افکار کے مطابق انسان ہی اپنے محسوس وجود کے پیش نظر اصالت کا مالک ہے اس کے علاوہ جن ماورا الطبیعی حقائق یا موجودات کا دینی و مذہبی عقائد کی رو سے وجود پایا جاتا ہیں انہیں ہم ثابت نہیں کر سکتے ہیں اگر چہ ان کا حقیقت میں وجود بھی ہو۔اس طرز فکر کے مطابق خدا کی ہستی اور دیگر مافوق الحواس موجودات کے وجود کو اگر چہ جھٹلا بھی نہ سکیں مگر اسی کے ساتھ ان کی موجودیت بھی ثابت نہیں کر سکتے ہیں۔کیونکہ انسان کے پاس معرفت کے حوالے سے ایسا کوئی مشخص، معقول اور صحیح ذریعہ نہیں ہے جس سے ان حقائق کی موجودیت پر استدلال کیا جا سکے۔یوں ذات باری تعالیٰ اور دیگر دینی امور کے متعلق پائے جانے والے سبھی مذہبی تعلیمات و بیانات جو یہودی ، عیسائی ، اسلامی اور بقیہ دیگر ادیان و مذاہب کے ذرائع سے پہنچے ہیں کا عقلی و تجربی بنیادوں کو مد نظر رکھ کر اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سیکولر مفکرین کے بقول دنیا کے سبھی مذاہب اور ان کے پیرو یہ دعوا کرتے ہیں کہ ان کا دین سب سے زیاد ہ راست و صحیح ہے اور بالخصوص ادیان ابراہیمی جیسے یہودیت ،عیسائیت اور اسلام کے متبعین سب اپنے طور پر یہ ادعا کرتے ہیں کہ ان کا دین اور اس کے قوانین سب سے زیادہ سچے اور فطرت کے عین مطابق ہیں۔باوجود اس کے ان مذاہب کے معتقدات کے ساتھ ساتھ ان کے قوانین میں بھی آپس میں کافی اختلافات پائے جانے کے علاوہ ان میں بقول سیکولر مفکرین کے فطرت انسانی کے ساتھ شدید ناہمواری و ناسازگاری پائی جاتی ہے۔مجموعی طور پر

سیکولر افکار کی رو سے کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہے جسے صحیح اور واقعی قرار دے سکیں بلکہ سبھی مذاہب اپنے اپنے اعتقادی دائرے میں اپنی حد تک صحیح ہے یا صحیح قرار دے جاسکتے ہیں مگر کسی مذہب کو معرفت شناسی کے حوالے سے کسی دیگر مذہب پر برتری نہیں دی جاسکتی ، بلکہ اس حوالے سے سبھی برابر ہیں۔ مذہبوں کی تکثیری نوعیت اور اس نوعیت پر مشتمل اعتقادی وتشریعی خلفشار کے پیش نظر سیکولرازم کے مطابق انسان اور انسانی معاشروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی وجودی اصالت وفطرت کو مدنظر رکھ کر ایسے قوانین واصول اور حدود وقیود کو خود وضع کر سکتے ہیں جو بالکل انسانی فطرت کے عین مطابق ہو اور جن میں زمان و مکاں کے سیال عنصر کو خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہو چونکہ یہ معلوم ہی ہے کہ مذہبی قوانین اپنی رجعت پسندی اور شدت پرستی کی خاطر زمان و مکاں کے متغیر تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتے ہیں جبکہ انسانی زندگی ہر لحظہ تغیر پذیر رہتی ہے، اس لیے انسان کو اپنے رشد و ارتقا کی خاطر ایسے قوانین وضع کرنا جو اس کے زمانی و مکانی شرائط کے عین مطابق ہوں ناگزیر ہو جاتا ہے۔سیکولرازم کی اس تحریک کو یورپ میں مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک(Reformation)کے بعد کے تاریخی ادوار میں کافی فروغ ملا ۔ مارٹن لوتھر کیتھولک مسیحیت کے غیر فطری اور غیر انسانی قوانین میں اصلاح کی خاطر اٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجے میں انہوں نے ایک جدید مسیحی فرقے یعنی پروٹسٹنٹوں کی بنیاد رکھی۔ بقول جاوید اقبال کے:

> مسیحی یورپ میں مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تحریک بھی تھی ... اس زمانے میں جن یورپی سیاسی مفکروں نے ''سیکولرازم'' کا فلسفہ پیش کیا ان میں بیشتر مادہ پرست دہرے یا ''ایگناسٹک'' تھے انہوں نے اخلاقی جرائم کی بیخ کنی کے لیے رائج مذہبی عدالتوں کے دائرہ اختیار کو صرف کلیسا سے متعلق مذہبی عناصر تک محدود رکھنے پر اصرار کیا اور عوام الناس کو ان کے دائرہ اختیار میں لانے کی

مخالفت کی ان کا استدال یہ تھا کی کیتھولک مسیحیت میں اخلاقیات کے اصول مستقل اور غیر متبدل ہیں اور ان کی خلاف ورزی پر جو تعزیری سزائیں مقرر کر دی گئیں ہیں وہ بھی غیر متبدل اور سخت ہیں ۔لیکن عقل ثابت کرتی ہے کہ اخلاقی قدریں جامد، مستقل یا غیر متبدل نہیں بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں ... پس ریاست میں اخلاقیات کے اصولوں کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں کلیسا کے بنائے ہوئے مستقل قوانین کی بجائے انسان کے وضع کردہ قوانین کا انعقاد ضروری ہے۔ [۲۶]

سیکولر دانشمند دنیوی و اخلاقی قوانین ،دین و دنیا اور روح و مادے کی ایک دوسرے سے تفلیک کے قائل ہیں ۔ ان کے بقول روح کا مادے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور روح کو مادے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے بلکہ یہ مادہ ہی ہے جو روح پر فوقیت رکھتا ہے ۔مزید یہ کہ دین کا حیات انسانی پر اطلاق ممکن نہیں ہے کیونکہ مذہبی قوانین بے لچک اور کسی منطقی بنیاد سے عاری ہیں اور انسان کی زندگی میں جس شعبے پہ بالخصوص دینی قوانین کا نفاذ عملاً ممکن نہیں ہے وہ سیاست کا شعبہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ دین سیاست سے قطعی طور پر جدا ہے۔ جب دین اور دنیا میں دوئی و جدائی مسیحی یورپ میں اصلاحی تحریک کے بعد عمل میں آئی تو کلیسا نے ایک دوسرے سے امتیاز کی خاطر مسیحی قوانین کو پاک ومقدس (Sacred)اور غیر دینی قوانین کو ناپاک و غیر مقدس (Secular) قرار دیا۔

اقبال کے نقطۂ نظر سے اسلام کی رو سے روح مادے سے جدا نہیں ہے اور نہ ہی مادہ روح کے بغیر کسی اصالت کا حامل ہے بلکہ یہ روح ہی ہے جو مادے پر فوقیت کا حامل ہے،اسی طرح دین سیاست سے جدا نہیں ہے بلکہ اسلام کے نظریے کے مطابق دونوں اصل میں ایک ہیں اور ایک دوسرے سے نا قابل انفکاک ۔مسیحی فکر کی طرح اسلام دنیا کو دو خانوں یعنی سکرڈ یا مقدس اور سیکولر یا غیر مقدس میں نہیں بانٹتا ہے ۔اسلام کی رو سے مادہ یا دنیا روح ہی کا ایک پرتو ہے اس لیے یہ دنیا یا مادہ خود بخود مقدس ہے ۔ بقول اقبال :

> قرآن پاک کے نزدیک حقیقت مطلقہ محض روح ہے اور اس کی زندگی عبارت ہے اس فعالیت سے جس کو ہم زماناً جلوہ گر دیکھتے ہیں لہٰذا یہ ''طبیعی''اور''مادی'' اور''دنیوی'' ہی تو ہے جس میں روح کو اپنے اظہار کا موقع ملتا ہے اور جس کے پیش نظر ہر وہ شے جسے اصطلاحاً ''دنیوی'' (Secular) کہا جاتا ہے ، اپنی اصل میں روحانی تسلیم کی جائے گی۔چناں چہ سب سے بڑی خدمت جو فکر حاضر نے اسلام بلکہ یہ کہنا چاہیے مذہب کی سرانجام دی ہے ، یہ اس کی وہ تنقید ہے جس کے ماتحت اس نے مادی او رطبیعی پر نظر ڈالی اور جس کا ماحصل یہ ہے کہ مادی کے بحیثیت مادی کوئی معنی ہی نہیں ، الا یہ کہ ہم اس کی جڑیں روحانی میں تلاش کریں، باالفاظ دیگر یہاں کسی ناپاک دنیا کا وجود نہیں برعکس اس کے مادے کی ساری کثرت روح ہی کے ادراک ذات کا ایک میدان ہے۔ [۶۷]

مشرقی دنیا بالخصوص اسلامی دنیا مغرب کی اس سیکولر فکری و سیاسی تحریک کی زد میں آ کر بری طرح متاثر ہوئی۔چناں چہ اسلامی دنیا میں سیکولرازم کی یلغار سے ایسے عناصر کو فروغ ملا جو دین کی سیاست سے جدائی پر مبنی سیکولر نظریے کی خوب راگ الاپ رہے ہیں اور انہیں اس منصوبے میں کافی کامیابی بھی میسر آئی۔اسلامی دنیا کے تقریباً بیشتر ممالک اس وقت عملاً سیکولر خطوط پر گامزن ہیں جس کے نتیجے میں وہ دھیرے دھیرے اور نامحسوس انداز میں ہر سطح پر سقوط و انحلال کی جانب تیزی سے بڑھ رہے ہیں ۔سیکولر فکر کی بے بند و باری ، دین زدائی ، اخلاق سوزی اور بے قید آزادی سے اسلامی دنیا اس وقت ایک داخلی تصادم کا شکار ہے جس نے ہرج ومرج اور تباہی و بربادی کے ابواب ہر حوالے سے کھولے ہیں ۔اقبال سیکولر فکر کی بے قید آزادی کو جو درحقیقت افراط وتفریط کا شاخسانہ ہے ابلیس کی ایجاد قرار دیتے ہیں :

اس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد[۶۸]

(آزادی افکار)

علاوہ بریں اقبال سیکولر یا بے دین سیاست کو کنیز اہرمن کے نام سے معنون کرتے ہیں۔ چونکہ لادین سیاست ابلیس کے اہداف و مقاصد کی برآری کی خاطر ہمہ تن کوشاں رہتی ہے اور یہ مقاصد و اہداف انسان کی ہمہ گیر تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور نہیں :

میری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر[۶۹]

(لادین سیاست)

لادین اور مردہ ضمیر سیاست مختلف شکلوں اور ہیئتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے کہیں یہ ملوکیت کے روپ میں ، کہیں اشتراکیت کے قالب میں تو کہیں نام نہاد جمہوری طرز حکومت کے دیو استبداد کی صورت میں ۔اقبال جمہوری طرز حکومت کے کہیں حامی نظر آتے ہیں اور کہیں مخالف کیونکہ جمہوریت ایسے مبہم تصورات ونظریات کی طرح ہے جن کی تعریف ومعنویات مشخص ومعین نہیں ہیں ۔بہرحال اقبال جس جمہوری نظام کے حامی ہے وہ اسلامی جمہوری نظام یا ان کے بقول روحانی جمہوریت کا ہے ۔ایسا جمہوری نظام اسلامی اصول وقوانین پر اپنی بنا رکھتا ہے اور یہ ایک مثلثی ترکیب پر مشتمل ہوتا ہے ۔اس مثلث کے اوپری سرے پر ذات باری یعنی عقیدہ توحید، دوسرے سرے پر ذات باری کی زمین پر مقرر کردہ رسالت کی صورت میں اپنی نمایندگی اور امور وعلوم رسالت کے ماہرین مثلاً علماء وفقہاء ہیں اور اس مثلث کے آخری سرے پر عوام ہوتی ہے، جو اسلامی قوانین واحکامات کی روشنی میں اپنے نمایندے اسلامی مجلس شوریٰ یا مجلس قانون ساز کے لیے چنتے ہیں۔اس طرح کی جمہوریت میں حاکم اعلیٰ و حاکم مطلق ذات باری شمار ہوتی ہے اور اعتباری طور پر ذات باری کے احکامات وقوانین کی روشنی میں ماہرین کی ایک

جماعت یعنی علماء وفقہاءعوام کی طرف سے منتخب ہوکران قوانین کی پیروی کر کےنظم ونسق چلاتے ہیں اور اجتہادی اصولوں کی روشنی میں قانون سازی کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں ۔یہاں پر یہ نکتہ واضح رہے کہ مجموعی طور پر اقبال کے نزدیک اسلام کے سیاسی نصب العین کی رو سے ''جمہوریت'' اسلامی تعلیمات کا ایک اہم پہلو ہے اور اس جمہوری نظام کی بنیاد تین اصولوں پر استوار ہیں ۔انسانی اتحاد،مساوات اور آزادی:

> جمہوریت اسلام کا ایک نہایت اہم پہلو ہے، اورمسلم ممالک میں انتخابات کی بنیاد پرمجالس قانو ن ساز کا قیام اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرتا ہے۔اسی اعتبار سے ظاہر ہے کہ حضرت علامہ کے نزدیک جمہوریت کی جو قابل قبول صورت ہے وہ صرف اسلامی جمہوریت ہی کی شکل ہے... اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت کی اساس توحید پر ہے اور توحید اپنے پرستاروں کوتین اصولوں کا پابند ہونے کی تلقین کرتی ہے۔وہ اصول یہ ہیں ۔(الف)انسانی اتحاد (ب) مساوات) اور (ج) آزادی... ایک اورمقام پر اسلامی جمہوریت کو روحانی''جمہوریت'' قرار دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک اسلام کا نصب العین دراصل ایک روحانی جمہوریت کے انعقاد کے یے راہ ہموار کرنا ہے ۔[۷۰]

اقبال جس طرز جمہوریت کے مخالف ہے وہ مادی یا سیکولر طرز جمہوریت ہے کیونکہ اس طرح کا جمہوری نظام دین اور سیاست کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے نظریے پرعملی طور پر کاربند ہوتا ہے۔ یہ اس بنا پر کہ ہستی مطلق اور دین کوکوئی قانونی وتشریحی پایہ وحیثیت اس طرز حکومت میں حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ اس نوعیت کے سیاسی نظام کے ارکان خود اپنے محدود محسوسات ، تجربات اورخواہشات ومصالح کو مدنظر رکھ کر قانون سازی کاعمل انجام دیتے ہیں ۔ جہاں تک اخلاقی ضابطۂ کار کا مسئلہ ہےتو لادین بنیادوں پہ استوار ہونے کی وجہ سے اس طرح کی حکومتوں کا کوئی واقعی اور مشخص اخلاقی ضابطہ نہیں ہوتا ہے برعکس اس کے ایسی حکومتیں اپنے

سیاسی مصالح و مفادات کو ملحوظ خاطر رکھ کر ہر چیز کے صحیح و غلط ،جائز و ناجائز اور اخلاقی و غیر اخلاقی ہونے کے حوالے سے فیصلہ کرتی ہیں ۔اگر چہ درحقیقت معاملہ اخلاقی اعتبار سے انتہائی مذموم ہی ہو ،مزید برآں عیاری و مکاری ،فریب کاری و دھوکہ دہی ، جنگ و نا امنی پھیلانا اور ویرانی و غارت گری سیکولر جمہوری نظام کی سرشت میں ہے ۔چونکہ یہ سیکولر جمہوری حکومتیں چند بڑے بڑے سرمایہ داروں(Corporate Bullys)اور کچھ اثر گزار سیاسی حلقوں کی حکمت عملی کے تحت بنتی ہیں اس لیے سرمایہ دارانہ مفادات کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر یہ جمہوریتیں عموماً اپنی داخلہ و خارجی سیاست کے خط و خال کا تعین کرتی ہیں ،باوجود اس کے کہ ان جمہوریتوں کا رنگ عوامی ہوتا ہے مگر بہ باطن یہ چند خودخواہ اور جاہ طلب مستبد عناصر کی ہاتھوں میں اسیر ہوتی ہیں اور ان خودخواہ ومستبد عناصر میں جو عنصر نمایاں ہوتا ہے وہ سرمایہ داروں کا ہی ہوتا ہیں ۔اپنے معاشی اور ناجائز سیاسی مفادات کے تحفظ کی خاطر دنیا کے کمزور ومستضعف ممالک کو اپنے استحصال کا شکار بنانااور ان مفادات کوحاصل کرنے کے لیے پوری دنیا میں جنگ و کشتار کابازار گرم کر دینا ان سیکولر جمہوری حکومتوں کاشیوہ عام ہے۔اس حوالے سے مغربی دنیا کی دوبڑی اور نمایندہ سیکولر جمہوریتیں یعنی برطانیہ اورامریکہ کو پیش نظر رکھا جاسکتاہے جن کی سابقہ سوسالوں پر مشتمل سیاسی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو صرف جنگ افروزی ، لوٹ مار اور تیسری دنیا کے کمزور ممالک بالخصوص اسلامی ممالک پہ قبضہ جمانے کے سوا کچھ نظرنہیں آتاہیں۔اقبال ان حکومتوں کے ابلیسی واستبدادی ا ور استعماری مکروہ چہرے کو جو مقدس جمہوری نقاب میں پوشیدہ ہے یوں برملا کرتے ہیں :

جمہور کے ابلیس ہے ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہہ افلاک[۱]

(ابلیس کی عرضداشت)

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی[۲]

ہم نے خود شاہی کو پہنایاہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر[43]

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر ازنوائے قیصری[44]

(سلطنت)

اس پہ مستزاد یہ کہ اقبال سیکولر مغربی جمہوریتوں کی خوں آشامیوں اور دہشت و بربریت کو جو انہوں نے دنیا کے اطراف واکناف میں بپا کردی دیکھ کر ''گلشن راز جدید'' میں اسی لیے اس جمہوری نظام کو دیو بے زنجیر اور تیغ بے نیام سے معنون کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فرنگ آئین جمہوری نہاد ست
رسن از گردن دیو کشاد است

(ترجمہ: مغرب نے جمہوریت کی جو بنا ڈالی ہے اصل میں انہوں نے اس نظام کی بنیاد ڈال کر ایک مرگ آفریں دیو کو زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے کیونکہ یہ جمہوری نظام ایک دیو کی مانند ہے۔)

زمن دہ اہل مغرب را پیامے
کہ جمہور است تیغ بے نیامے

(ترجمہ: میری طرف سے اہل مغرب کو کہو کہ آپ کی یہ جمہوریت بے نیام تلوار کی مانند ہے۔)

چہ شمشیرے کہ جانہامی ستاند
تمیز مسلم و کافر نداند[45]

(ترجمہ: ایسی بے نیام اور بے رحم تلوار فقط قتل وغارت گری کرنا جانتی ہے، ایسی قتل و غارت

گری جس میں مسلم و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔)

اقبال کی اس طرز جمہوریت کے ساتھ مخالفت کی ایک اور وجہ بھی تھی ۔وہ یہ کہ اس میں ایک سیاسی جماعت یا ایک سیاسی گروہ کسی صلاحیت و اہلیت کے بغیر ہی اپنے اثر ورسوخ یا سرمایے کی بنا پرزیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے میں آسانی کے ساتھ کامیاب ہوتا ہے، پھر اس برتری حاصل کرنے والی جماعت کے لیے ایک طرح کے آمرانہ خطوط پر گامزن ہونے کے لیے بڑی آسانی میسر ہوتی ہے جس کی مدد سے اپنی من مانیوں کومسلط کرنا ممکن ہوتا ہے۔اس سے بھی بڑھ کر جوستم ظریفی اس طرح کے جمہوری نظاموں میں پائی جاتی ہے وہ لائق و صالح ہونے کے ساتھ ساتھ بھر پور صلاحیت و اہلیت کے حامل افراد کا اس طرح کے جمہوری و سیاسی نظام میں منزوی ہونے کا ہے۔کیونکہ علم وفضل والے اہل الرائے اور صاحب درایت لوگ عموماً مالی اعتبار سے مفلوک الحال ہوتے ہیں جب کہ نا اہل و نا ہنجارقسم کے افراد زیادہ تر سیاسی اثر و رسوخ کے حامل ہونے کے علاوہ بڑے ثروت مند بھی ہوتے ہیں جس سے وہ آسانی کے ساتھ عوام سے ووٹ خرید کر اقتدار پر اپنا قبضہ جماتے ہیں۔ان ناہنجار وتخریبی عناصرکو اس طرح ایک مطلق نوعیت کی آزادی حاصل ہوتی ہے جو ان کے لیے جائز و ناجائز سرمایہ کمانے اور فساد وغارت گری کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کے ساتھ رعایا کو ہر سطح پر پایمال کرنے کی راہ ہموار کرتی ہے۔خلیفہ عبدالحکیم اسی لیے کہتے ہیں کہ:

> اسی جمہوریت کے متعلق علامہ فرماتے ہیں کہ اس میں انسانوں کو گنا جاتا ہے اور تولا نہیں جاتااور اس قسم کے دو سو گدھے بھی اگر ایک ایوان میں ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے کے لیے جمع ہوجائیں تو کوئی انسانیت کی آواز تو وہاں سنائی نہیں دے سکتی۔[۶۷]

اور بقول اقبال:

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہرچند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے[۴۷]

(جمہوریت)

سیکولر جمہوریت کے انہیں نقائص و اسقام کے پیش نظر اقبال اس کے شدید مخالف ہے۔ یہ نقائص واسقام سرمایہ اندوزی ،استبداد وآمریت اور استعمار کی ابلیسانہ ماہیت پر مشتمل ہیں۔

حسی عقلیت پرستی ،نژاد پرستی ، وطنیت ، ملوکیت ، سرمایہ داری ، اشتراکیت اور سیکولر جمہوریت یہ سبھی عناصر مل کر ایک تہذیب و تمدن کی تشکیل کرتے ہیں اور اس تہذیب و تمدن کی جو بنیادی خصوصیت اور جو امتیازی وصف ہے وہ مادہ پرستی اور دین ستیزی ہیں ۔جس نے اس کو انسانیت کے بنیادی اوصاف سے محروم کر کے ایک بہیمانہ پن اور وحشی گری سے پوری طرح آلودہ کردیا۔ جب پوری دنیا کو بہ نظر غائر دیکھتے ہیں تو مادہ پرستی و دین ستیزی کے آثار زیادہ تر مغربی تہذیب وتمدن میں نظر آتے ہیں ۔یہ تمدن فطرت اور انسان کی روحانی سرشت سے منہ موڑ کر صرف مادے کی محسوس رنگارگیوں میں محبوس ہوکر رہ گیا۔محسوسات اور مادی امور کے ساتھ مغرب کی شیفتگی نے اگر چہ انہیں تسخیر عالم اور فطرت کے دیگر پوشیدہ اسرار و رموز کے انکشاف و انکشاف میں بلند بانگ کامرانیاں نصیب کیں مگر اہل مغرب اور انسانوں کی اکثریت اس کی وجہ سے روحانی معنویت سے محروم ہو کر ایک نفسیاتی بحران کا شکار ہوگئے جو بہت سی تباہیوں اور نت نئے مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔اقبال مغرب اور مغربی تہذیب و تمدن کے مادی جنون کو ابلیسی القاٰت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنان عرش اعظم کی تمناؤں کا خوں[۴۸]

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

ابلیس اس کائنات اور دنیا کو عناصر کے پرانے کھیل سے معنون کرکے اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ یہ کائنات کسی حکیم و قدیر ہستی کے ارادے سے وجود میں نہیں آئی اور نہ ہی یہ

اس کے ارادے وحکمت و تدبیر کی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیےمحتاج ہے۔یہ اپنی آزادی و اختیار سے بنی اور مادے کی جست و خیز سے اس کائنات کا سامان حیات ہو رہا ہے ۔مغربی تہذیب وتمدن نے بھی اس ہستی وکائنات کومادی عناصر کے آزادنہ اور خود ارادی تعمیر وتخریب کا عمل مان کر اس کے پیچھے کسی اخلاقی و روحانی غایت و مقصد کے ہونے کو یکسر مسترد کردیا اور اسے اپنے دست تصرف میں لانے کے لیے اپنی حسی عقل کے بل بوتے پر اس کے ساتھ دست وگریباں ہوئی۔مگر اس کشمکش وسعی عمل میں عقل عیار اپنی کوتاہ بینی وکوتاہ اندیشی کے سبب صرف اپنے مادی منافع اور بوالہوسیوں کے گرداب میں پھنس کر دوسرے عظیم معنوی محامد کا ادراک نہ کر سکی۔ بقول سید مجتبیٰ موسوی لاری:

> اس تمدن کی دنیا میں عقل کا کام صرف منافع حاصل کرنا ہے۔ مادی چیزوں کے علاوہ گویا عقل کسی اور چیز کا ادراک ہی نہیں کر پاتی ،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلتوں کا فقدان ہوگیا بہت سے اخلاقی مفہوم موت کے ہاتھوں سپرد خاک ہوگیے اور یہ ایسا زخم ہے جس کا اندمال ناممکن ہے۔ [۹]

اس تہذیب کو مادے اور عقل پرستی کے مرض نے روحانی و مثالی فضیلتوں کی اقدار سے کلیتًا محروم کردیا۔آدمیت و انسانیت کے امتیازی اوصاف سے تہی دستی نے مغربی تہذیب کو عظیم انسانی مقاصد و اہداف تک رسائی حاصل کرنے سے روک دیا؛ جو انسان دوستی ، وحدت انسانی، مساوات و برابری اور صلح و آشتی کے مفاہیم سے عبارت ہیں۔ یہ تمدن انسان ستیزی ، انسانی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور انسان کے ساتھ امتیازی سلوک و استحصال روا رکھنے کے علاوہ مخاصمت وکشت و کشتار کے شیطانی کھیل کو فروغ دینے میں ہمہ تن کوشاں ہیں۔ اقبال کے بقول مغرب کی اس بہیمانہ خصلت و رویے کی بنیادی وجہ اس کا ایک اعلیٰ روحانی آئیڈیل سے مبرا ہونے میں ڈھونڈا جاسکتاہے۔ یہ ایک عظیم و مثالی روحانی نصب العین ہی ہوتا ہے جو اقوام کو مادے کے تاریک گرداب سے افلاک کی قدسی پاکیزگیوں سے ہمکنار کرواتاہے۔

ستم ظریفی کا عالم یہ ہے کہ یہ تہذیب اپنی وحشت خیزیوں کو چھپانے کے لیے ابتدا سے

ہی فریب کاریوں کا سہارا لیتی رہی ہے۔خوشکن و خیرہ کنندہ نعرو ں جیسے آزادی و استقلال، مساوات و برابری و برادری ، عالمی امن اور انسانی حقوق کے احترام وغیرہ کا ڈھنڈورا پیٹ کر انکی آڑ میں اپنے مذموم شیطانی اغراض کو پانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہی ہے۔طرہ یہ کہ دنیا کو امن سلامتی کا درس دے کر اب تک کی خوں ریز ترین جنگوں کا سبب یہ تہذیب بن چکی ہے۔دو عالم گیر جنگوں کو اپنی جاہ طلبی اور استعماری مفادات کی خاطر چھیڑ کر لاکھوں کروڑوں انسانوں کو تہہ تیغ کر چکی ہے اور جنگوں و خوں ریزیوں کا نہ تھمنے والا یہ سلسلہ جاری و ساری ہیں جس سے اس تہذیب کی منافقت واضح ہورہی ہے۔اس تہذیب کا چہرہ ظاہراً بہت ہی زرق و برق اور نرم و نازک ہے مگر اس کا اندرون نہایت ہی وحشت ناک ہے۔ اقبال اسی لیے اس مادی تہذیب کی منافقت کو پہلی جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی اپنی نظم'' تہذیب'' میں کھل کر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

انسان کہ رخ ز غازۂ تہذیب بر فروخت
خاک سیاہ خویش چو آئینہ وا نمود

(ترجمہ: انسان (اقوام مغرب) نے اپنے چہرے کو تہذیب کے غازے سے بڑا ہی دلکش بنا رکھا ہے مگر اس دعوائے تہذیب کے باوجود اس نے اپنی وحشت خیزی کی اصلیت کو جنگ عظیم میں آئینے کی طرح دکھا دیا۔)

پوشید پنجہ را تہ دستانہ حریر
افسونی قلم شد و تیغ از کمر کشود

(ترجمہ: اس نے ریشم کے دستانوں میں درندے کے پنجے چھپا لیے اور تلوار نیچے رکھ دی ،اس کے بجائے قلم (علم و دانش، صلح و آشتی وغیرہ) کا درس دینے لگی مگر یہ سب عیاری و دھوکہ دہی ہے۔)

ایں بو الہوس صنم کدہ صلح عام ساخت
رقصید گردِ او بنوا ہاے چنگ و عود

(ترجمہ:اس حریص نے ایک بتخانہ بنام صلح عام (World peace)بنایااور اس کا طواف

کرکے یہ ڈھنڈورا بڑے زور وشور سے پیٹنے لگا کہ میں امن کا علمبردار ہوں۔مگر جنگ عظیم میں اس دعوے کی اصلیت سب پے کھل گئی اور اس تہذیب کا مکروہ چہرہ سامنے آگیا۔)

دیدم چو جنگ پردہ ناموس او درید
جز "یسفك الدما خصیم مبین" نبود[80]

(ترجمہ: پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ شائستگی کی مدعی یہ مغربی تہذیب اصل میں انسانیت کے خون کی پیاسی ہے ۔(اسطرح فرشتوں کی وہ پیشن گوئی بھی ثابت ہوئی کہ انسان بڑا خون ریز ہے۔)

مغربی تہذیب کا جارحانہ و چنگیزی رخ طول تاریخ میں نمایاں سے نمایاں ہوتا گیا۔اس کی خوں آشامی اور اس کے استعماری عزائم کے پیچھے ایک خاص نوعیت کی ذہنیت کارفرماں تھی جو اپنی نسلی وتمدنی بالادستی اور علمی وتکنیکی فتوحات کے زعم میں دنیا کی بقیہ اقوام کو وحشی وغیر متمدن اور علم وشعور سے عاری قرار دیتی ہے ۔اس ذہنیت کے نقطۂ نظر سے یہ مغرب کی متمدن و تہذیب یافتہ اقوام کے لیے بہت ضروری تھا کہ دنیا کی بقیہ غیر متمدن اور جاہل اقوام کوتہذیب و شائستگی اور علم و ہنر سے نوازنے کے لیے انکو اپنے دست تصرف میں لیں ۔ اس استعماری ذہنیت اور نسلی غرور کے متعلق فرانس کے ایک معروف استعماری جولز ہرماند(Jules Harmond)کے وہ الفاظ و خیالات جوانہوں نے ۱۹۱۰ء میں کہے تھے ملاحظ ہو:

> It is necessary, then, to accept as a principle and point of departure the fact that there is a hierarchy of races and civilizations, and that we belong to the superior race and civilization, still recognizing that, while superiority confers rights, it imposes strict obligations in return. The basic legitimation of conquest over native peoples is the conviction of our superiority, not merely our mechanical, economic and military superiority but our moral superiority. Our dignity rests on that quality, and it underlies our right to direct the rest of humanity. Material power is nothing but a means to that end.[81]

اقبال اس ذہنیت کی تصویر کشی اپنی نظم ''انتداب'' میں یوں کرتے ہیں:

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے
نہیں زمانہ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں ،زن تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مے خواری
نظر وران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سر زمیں مدنیت سے ہے ابھی عاری![۸۲]

انتداب اور برتر تہذیب کے دبیز پردے میں مغرب کی استعماری قوتوں نے کمزور افریقی،لاطینی اور ایشائی مما لک پر قبضہ جما کر انہیں لوٹنا شروع کیا۔اس استعماری یلغار میں جو مما لک بنیادی طور پر گرفتار ہوئے وہ اسلامی مما لک ہیں۔ استعمار نے پہلے اسلامی دنیا کی وحدت پارہ پارہ کردی ،حصے بخرے کرنے کے بعد پھر آہستہ آہستہ ان مما لک پر اپنا قبضہ وتسلط جما کر ان کو اپنی غارت گری کا بھر پور طور پر نشانہ بنا لیا ۔علاوہ ازیں اسلامی مما لک کو داخلی خلفشار ، اختلاف و افتراق میں جھونک کر استعماریوں نے بڑی سہولت کے ساتھ ان کے وسائل کو تاراج کر دیا۔استعماری غلبہ ونفوذ سے ملت اسلامیہ اپنے فکری و سیاسی استقلال و شناخت سے محروم ہوگئی جس کے بدترین نتائج اب تک سامنے آرہے ہیں ۔فکری و سیاسی تسلط قائم کرنے کے لیے استعمار کے پاس بہت سے ذرائع اور وسائل ہیں۔جن میں پیشا پیش نام نہاد عالمی امن وسلامتی اور انسانی فلاح و بہبود کے بین الاقوامی ادارے ہیں ۔یہ ادارے سامراجی مما لک کے ہاتھوں میں اسیر ہوکر کٹھ پتلیوں کی حیثیت سے ان کی شہہ پر کمزور مما لک بالخصوص اسلامی مما لک میں سامراجی اثر ورسوخ کو بڑھاوا دینے کی خاطر مختلف شکلوں میں سرگرم عمل ہیں۔اس حوالے سے ۱۹۲۰ء میں جمعیت الاقوام کی صورت میں پہلی بار ایک بڑے استعماری ادارے کی سنگ بنیاد رکھی گئی۔اس جمعیت کا جو ہدف تھا وہ امن عالم کے نام پر استعمار گری اور اس کے ناجائز مفادات کو عملی جامہ پہنانا تھا۔اقبال اس ادارے کی استعماری خو وسرشت کے پیش نظر اسے کفن چوروں کی

انجمن کا نام دے کر کہتے ہیں:

برفتند تاروش رزم دریں بزم کہن

درد مندان جہاں طرح نو انداختہ اند

(ترجمہ: دنیا کو جنگ وجدال سے پاک کرنے کے لیے اس جہان کے نام نہاد دردمند (مغربی استعماری ممالک) ایک جگہ جمع ہوکر ایک انجمن کی بنیاد ڈالتے ہیں۔)

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند

بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند[۸۳]

(جمعیت الاقوام)

(ترجمہ: اقبال کہتے ہیں کہ میرے علم کی جہاں تک بات ہے یہ انجمن کفن چوروں کی انجمن ہیں۔ یہ ایسی استعماری جماعت ہیں جس کا مقصد وحید یہ ہے کہ دنیا کے کمزور ملکوں کو تقسیم کرکے کس طرح بڑی صفائی کے ساتھ آپس میں بانٹ لیں۔)

جمعیت الاقوام (League of Nations) خود تاریخ کے قبرستان میں دفن تو ہوئی مگر ۱۹۴۵ء میں اس جمعیت کی وارث موجودہ اقوام متحدہ (UNO) بنی جو بالکل جمعیت الاقوام ہی کے رہنما خطوط پہ گامزن ہے کہ کس طرح اقوام عالم پر استعماری تسلط و اثر و رسوخ کو وسیع سے وسیع تر کریں۔ بدقسمتی سے اسلامی ممالک اس لاش خور استعماری ادارے کی ابلیسی چالوں اور پالسیوں کا بڑے پیمانے پر نشانہ بنے ہوئے ہیں۔صرف چند ایک ممالک کو چھوڑ کر باقی ساری اسلامی دنیا مغربی استعماریوں کے رحم و کرم پر جی رہے ہیں۔

مادی تہذیب کے علاوہ ابلیس کے معنوی مظاہر میں تقدیر پرستی یا مسئلہ جبر و اختیار کو ایک اہم مظہر مانا جاتا ہے۔ اقبال کے فکر و نظر میں ابلیس تقدیر پرستی کے اولین معماروں میں سے گنا جاتا ہے ۔کیونکہ وہ اپنے طغیان و عصیان کو خدا کی جانب منسوب کرتے ہوئے یہ توجیہ پیش کرتا ہے کہ خدا کی مشیت میں لکھا تھا کہ میں تکبر و استکبار سے کام لے کر آدم کو سجدہ نہ کروں ۔یعنی ابلیس کے مطابق وہ اس امر میں مجبور محض تھا۔اقبال نے اس حقیقت کا نقشہ نظم ''تقدیر''

میں اس طرح کھینچا ہے:

(ابلیس و یزداں)

ابلیس	اے خدائے کن فکاں ! مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
	آہ! وہ زندانی نزدیک ودور و دیر و زود
	حرف ''استکبار'' تیرے سامنے ممکن نہ تھا
	ہاں ، مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
یزداں	کب کھلا تجھ پر یہ راز، انکار سے پہلے کہ بعد؟
ابلیس	بعد،اے تیری تجلیٰ سے کمالات وجود!

یزداں

(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

پستی فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے

کہتا ہے''تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود''

دے رہا ہے اپنی آزادی کومجبوری کا نام

ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود! [۸۴]

جبر و اختیار کا مسئلہ اپنی ابتدا ہی سے دنیا کے فلا سفہ ومفکرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے کہ آیا انسان دنیا میں اپنے اعمال و افعال کی رو سے مجبور محض ہے یا مختار مطلق؟اس کے علاوہ دنیا کے سبھی مذاہب میں یہ مسئلہ اعتقادی طور پر ایک نمایاں اہمیت کا حامل رہا ہے اور اسلام میں یہ مسئلہ ایک اہم اعتقادی مسئلہ شمار کیا جاتا ہے۔ اسلامی علم کلام میں جو مسئلہ سب سے زیادہ بحث ونزاع کا موضوع بنا ہوا ہے وہ یہی جبر و اختیار کا مسئلہ ہے۔ بقول شہید مرتضیٰ مطہری:

> بظاہروہ پہلا مسئلہ جو مسلمانوں کے درمیان بحث و نزاع کا باعث بنا ہے یہی جبر و اختیار کا مسئلہ ہے۔ اور یہ اختلاف ایک فطری بات تھی، کیونکہ اولاً یہ مسئلہ انسان کی سرنوشت سے تعلق رکھتا ہے اور ہر بالغ نظر انسان کو اپنی

سرنوشت سے دلچسپی ہوتی ہے، شاید کوئی ایسا معاشرہ نہ ہوگا جس کے درمیان بالغ نظر افراد موجود ہوں اور وہاں یہ مسئلہ نہ چھڑا ہو۔ ثانیاً اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیتیں موجود ہیں جو اس بنیادی مسئلہ پر غور وفکر کے لیے انسان کے افکار کو مہمیز کرتی ہیں۔[85]

قرآن حکیم انسان کو اپنے ارادے اور عمل کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے کچھ تکوینی محدودیتوں کا قائل ہے۔ قرآن مجید انسان کے فاعل مختار ہونے کے حوالے سے کہتا ہے:

انا ھدیناہ السبیل اماشاکراً وا ماکفورا.[86]

(ترجمہ: ہم نے انسان کو ہدایت کی راہ دکھائی ہے اب یہ اس پر ہے کہ آیا وہ اطاعت کرتا ہے یا عصیان۔)

قران کریم جن تکوینی محدودیتوں کا ایک انسان کے لیے قائل ہے اور جبری اپنے عقیدے کے حوالے سے جنہیں دلیل قرار دیتے ہوئے پیش کرتے ہیں ان آیات مبارکہ میں سے ایک آیت یہ ہے:

من یشاء للہ یضللہ و من یشاء یجعلہ علیٰ صراط مستقیم[87]

(ترجمہ: اللہ جسے چاہتا ہے اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔)

ان آیات اور دوسری روایات کو مدنظر رکھ کر اسلامی فلاسفہ اور متکلمین مسئلہ جبر و اختیار کے حوالے سے اختلافات کا شکار ہو کر مختلف گروہوں میں بٹ گیے۔ جن میں سب سے نمایاں دو گروہ بنام جبریہ وقدریہ اسلامی فلسفہ وعلم کلام کی تاریخ میں کافی معروف ہیں ۔ جہاں تک جبری مکتبۂ فکر کا سوال ہے وہ اس عقیدے کے قائل ہیں کہ خدا نے انسان کو مجبور محض پیدا کیا ہے۔ خداوند قادر مطلق ہے اور اسکی مشیت ،حکم اور اختیار کے بغیر کائنات کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتا۔ وہ عالم وتوانا ہے جو کچھ ہورہا ہے اور جو کچھ ہوگا اسے اس کا علم ہے،غرض جو کچھ انجام پارہا ہے عین اسکی منشاء کے مطابق ہورہا ہے۔ دوسرا مکتبۂ فکر جو قدریہ کے نام سے

معروف ہے ان کا عقیدہ ہے کہ خدانے انسان کو عقل ،حواس ووجدان کی عظیم نعمات سے نوازا ہیں ، اسے اشیاء کے حسن و قبح میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے نواز کر اس طرح اسے انتخاب و اختیار کے حق سے سرفراز کیا ہے ۔ انسان اپنی قوت ارادی کی بدولت جو اسے خدا نے عطا کی ہے اپنی پسند و ناپسند کا خود مالک ہے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اپنے اعمال و افعال کے تعلق سے اسے کامل اختیار حاصل ہے۔جبریہ وقدریہ جنہیں بالترتیب اشاعرہ ومعتزلہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہیں کے علاوہ اسلامی فلاسفہ و متکلمین کا تیسرا گروہ بھی ہے جو نہ تو انسان کو مجبورِ محض اور نہ ہی مختار مطلق گردانتے ہیں۔انہوں نے جبریہ و قدریہ سے بالکل ایک مختلف انداز میں بیچ کی راہ اختیار کی ہے۔بقول اس گروہ کے:

لا جبرو لا تفویض بل امر بین الامرین [۴۸]

(ترجمہ: نہ جبر ہی ہے نہ اختیار بلکہ حقیقت ان دو کے بیچ میں سے ہے۔)

یعنی انسان مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔علاوہ ازیں ایک اور گروہ بھی پایا جاتا ہے جن کا اعتقاد ہے کہ مسئلہ جبر و اختیار ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس کو درک کرنے کی صلاحیت انسانی عقل میں نہیں پائی جاتی ہے۔چونکہ یہ ایک ماورائی مسئلہ ہے اس لیے اس میں غور وفکر اور بحث وتمحیص سے کام لینا بے فائدہ ہے۔ان سب نظریات میں سے تیسرا نظریہ جس کی رو سے انسان نہ تو پوری طرح مختار ہے اور نہ مجبور ایک اعتدالی نظریہ دکھائی دیتا ہے؛ اس کے مطابق انسان احساس ذمہ داری اور توکل کی باہمی متوازن فضا میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ جہاں تک جبریہ کا تعلق ہے تو ان کی رو سے انسان پر کوئی فکری و عملی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس انسان کے نیک و بد اعمال کی ذمہ داری خود خدا پہ عائد ہوتی ہے کیونکہ انسان کو اس نے مجبور محض پیدا کیا ہے۔رہا قدری نقطۂ نظر تو وہ انسان کو مطلق طور پر صاحب اختیار مانتا ہے جس سے خدا کی مشیت اور اسکے ارادہ وعلم پر اشکال وارد ہوتے ہیں۔اجمالی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسئلہ قضاو قدر کے حوالے سے جبری وقدری نقطۂ نظر افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔ اسلامی اجتماع پر جس نظریے کے بہت برے اثرات پڑے وہ جبری یا تقدیر پرستی کا عقیدہ و نقطۂ نظر تھا ۔ اس عقیدے نے

مسلمانوں کو ذوق عمل اور جدوجہد سے باز رکھا جس کا نتیجہ مسلمانوں کی عملی وفکری پسماندگی کی صورت میں برآمد ہوا۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان کو خدا نے ایک خاص دائرے میں اور کچھ حدود و قیود کے ساتھ آزاد پیدا کیا ہے اور اسے عقل ،فکر اور ارادے کی قوت سے نوازا ہے۔انسان اپنے اعمال و افعال میں جمادات اور دوسری بے جان اشیاء کی مانند نہیں ہے جو بس ایک خاص سمت میں بغیر کسی ارادے کے رواں دواں ہے اور نہ ہی انسان حیوانوں کی طرح طبیعی غرائض کے فشار کے تحت اپنی سرگرمیاں اور اپنے اعمال انجام دیتا ہیں۔برعکس اس کے انسان ہمیشہ انتخاب اور ارادے کے چوراہے پر کھڑا رہتا ہے اور اس پر کسی قسم کا خارجی نوعیت کا جبر نافذ نہیں ہوتا ہے کہ تمھیں ایک خاص راہ کا انتخاب کرنا ہے۔انسان اس معاملے میں بالکل آزاد ہے کہ وہ اپنے فکرو نظر اور میلان و ارادے سے کسی بھی راہ کا انتخاب کرسکتا ہے،یہ راہ سعادت کی بھی ہوسکتی ہے اور شقاوت کی بھی۔یہاں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ آخر کیونکر مسلمان جبری عقیدے یا تقدیر پرستی کی زد میں آکر عملی اور اکتشافی دنیا میں مفلوج ہوکر رہ گیے۔اقبال کے بقول اس تقدیر پرستی اور جبر گرائی کی دو وجوہات تھیں ایک وجہ فلسفیانہ نوعیت کی تھی اور دوسری سیاسی اغراض و مقاصد پر مشتمل تھی:

> یہاں صرف اتنا عرض کردینا کافی ہوگا کہ یہ تقدیر پرستی جس کو مغربی مصنفین لفظ قسمت سے ادا کرتے ہیں، کچھ تو نتیجہ تھی بعض فلسفیانہ افکار اور کچھ سیاسی مصلحت پسندیوں کا۔پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی کی وہ قوت جو اسلام نے مسلمانوں کے اندر پیدا کی تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور آگے چل کر جب فلسفہ نے اس امر کی تحقیق میں کہ علت کا اطلاق اگر ذات ایزدی پر کیا گیا تو اس کے معنی کیا ہونگے ،علیٰ ہذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ علت ومعلول کو آپس میں جو نسبت ہے زمانہ اس کی شرط ضروری ہے

ایک ایسے خدا کا تصور قائم کیا جو موجودات عالم سے وراء الوراء قدیم ہی سے موجود اور اس لیے خارج سے اس پر عمل کر رہا ہے۔لہٰذا کہا گیا کہ علت ومعلول کا سلسلہ چونکہ بالآخر ذات خداوندی پر ختم ہو جاتا ہے، اندریں صورت جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا ہی کے حکم سے ہورہا ہے۔دوسری جانب دمشق کے موقع شناس اموی فرمانرواؤں کو بھی جو عملاً مادہ پرستی اختیار کر چکے تھے کسی ایسے عذر کی ضرورت تھی جس سے وہ کربلا کے مظالم پر پردہ ڈال دیں تاکہ اس طرح عوام کو موقع نہ ملے کہ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور انہیں امیر معاویہ کی بغاوت کے ثمرات سے محروم کردیں ۔چناں چہ کہا جاتا ہے جب معبد نے حسن بصری سے کہا اموی مسلمانوں کو قتل کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی یونہی تھی تو حسن بصری نے کہا ''یہ اللہ کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں''۔ [۸۹]

اقبال کے لیے مسئلہ جبر ایک اہم مسئلہ تھا کیونکہ اس سے ان کے فلسفہ خودی کی نفی ہوتی تھی۔تقدیر پرستی سے قوت عمل اور ذوق نمود کے سرچشمے جو خودی کے اساسی ارکان میں سے ہیں خشک پڑتے ہیں۔یہی وجہ ہے اقبال اس ابلیسی تصور کے خلاف بھرپور طریقے سے احتجاج کرتے ہیں اور امت اسلامیہ کو ذوق عمل اور حرکت ونمود کی تلقین کرتے ہیں۔مسلمان عقیدہ جبر کی وجہ سے کوشش وجستجو سے ہاتھ دھو بیٹھے جس کے بڑے مضر نتائج برآمد ہوئے، اس طرح مسلمانوں کی زندگی پر ہر سطح پہ ضعف و اضمحلال نے اپنا ڈھیرا جما لیا۔سیاسی ،سماجی،اقتصادی اور بالخصوص علمی و اکتشافی سطح پر مغربی اور دیگر اقوام کے مقابلے میں ملت کافی پسماندہ رہی، مثال کے طور پر اگر دفاعی سطح کی بات کریں تو مسلمان دفاعی صنعت کے معاملے میں کافی عقب ماندہ رہے،صرف چند ایک ممالک اس حوالے سے کسی حد تک پیش رفت کر چکے ہیں۔دفاعی سطح کے اس ضعف و ناتوانی نے ملت کو استکباری طاقتوں کی یورشوں کی آماجگاہ بنا دیا۔اس ضعف وسستی کے پیچھے تحقیق وتجسس کی کمی اور ذوق انکشاف کا فقدان تھا۔اس فقدان کے پس پشت جبر وتقدیر پرستی کی نفسیاتی

علت بنیادی طور پر کارفرما رہی ہے۔ تقدیر پرستی و جبر گرائی کی یہ نفسیات امت پر سامراجی طاقتوں اور دیگر اجانب کی آٹھ سو سالہ یورشوں اور ان کے غلبے و سیاسی عدم استحکام سے طاری ہوئی۔ منجملہ ان وجوہات نے یاس و نا امیدی کو مسلمانوں کے تخلیقی سرچشموں پر مسلط کر دیا جس کے نتیجے میں مسلمان اسلام کے پیام عمل اور اختراع و ایجاد کی قوت سے دستبردار ہوگیے۔ بقول اقبال:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہو ا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ[90]

(ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض)

اسی قرآں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
''تن بہ تقدیر'' ہے آج ان کے عمل کاانداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ''ناخوب'' بتدریج وہی ''خوب'' ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر[91]

(تن بہ تقدیر)

مسلمان عملی طور پر کار زار حیات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے تقدیر پرستی اور یاس و ناامیدی کے گرداب میں پھنس کر زندگی کی ساری شورشوں اور ہنگامہ آفرینیوں سے منہ موڑ کر تاریخ کے ایک خاص مرحلے پر مفلوج ہو کر بالکل سکتے میں آگیے۔ اقبال اسی لیے ابلیس کی زبانی تقدیر پرستی کی بازیافت یوں کرواتے ہیں:

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں[92]

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

تقدیر پرستی جسے قسمت بھی کہتے ہیں ہر لحظ بدلتی زندگی کے فطری اصولوں سے متصادم ہے ۔اس تغیر پذیر اوررواں دواں ہستی میں حیات اپنے ارتقائی عمل کے تحت نئے سے نئے مدارج و مقامات کو طے کرتی رہتی ہے۔زندگی کا یہ تغیر پذیر عمل اور ارتقائی جھش وجنبش ہستی کی تغیر پذیری کے بنیادی عامل کی فیض رسانی کا نتیجہ ہے ۔یہ بنیادی عامل خداوند کی لامتناہی ذات ہے جو ہرلحظہ اور ہر آن ایک نئ شان میں ہے؛یہ نئ شان مسلسل قوت و ارادے کی حامل ہوتی ہے جس سے ہستی اپنی نو بہ نو منزلوں کو سر کرتی ہے۔ اس ہستی میں جو خدا وند تبارک وتعالیٰ کی تخلیقی قوت کا ایک عظیم وشان اور بے نظیر نمونہ ہے وہ انسان کی ذات ہے۔انسان پر الوہی فیوضات ہر لحظہ ایک نئ سے نئ صورت اور ایک نئے سے نئے امکان کے تحت نازل ہوتے رہتے ہیں تا کہ وہ اپنے بے انتہا ارتقائی منازل کو طے کر کے تخلیقی قوت کے عظیم مرتبے پر فائز ہو جائے۔ ان حقائق کو ذہن میں رکھ کر تقدیر پرستی اور جبریت کے فعلی جمود کی کوئی حقیقت نہیں رہتی ہے بلکہ یہ انسان کا عزم و ارادہ ہے جو اس ارتقائی عمل کو فیوضات الٰہیہ کے سایے میں جاری ساری رکھنے کا اصلی عامل ہے۔تغیر اور تسلسل کے آفاقی اصول کو اپنے اعمال و افعال و کردار کے حوالے سے جن اقوام نے اپنی طینت میں جگہ دی وہ فطرت اور اس کے توانا مظاہر کو اپنے دست تصرف میں لینے لگے اور خود مالک تقدیر بن بیٹھے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[۹۳]

تقدیر پرستی اور جبر گرائی کے فروغ کا ایک زبردست سبب رہبانی تصوف رہا ہے۔جس سے امت محمدی کے قویٰ عمل مضمحل ہوگیے ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال رہبانی نوعیت کے غیر اسلامی تصوف کے شدید مخالف تھے۔ جبکہ یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہے کہ اقبال خالص اسلامی تصوف جسے ہم دوسرے لفظوں میں عرفان بھی کہہ سکتے ہیں کے بڑے شیدائی تھے۔رہبانی تصوف اسلامی دنیا میں تقریباً دوسری تیسری صدی ہجری میں رائج ہوا۔ یہ تصور نو افلاطونی ،مجوسی ،ویدانت اور بدھ مت وغیرہ کے عقائد اور اخلاقی تعلیمات کا معجون مرکب ہیں۔ جب دوسری تیسری صدی

ہجری میں اسلامی دنیا کے روابط اپنی تبلیغی وتوسیعی سرگرمیوں کی بدولت وسیع سے وسیع تر ہوئے تو نتیجتاً اس ارتباطی فضاء میں راہبانہ تخیلات وتصورات اور طرز زندگی اسلامی دنیا میں نفوذ کر گیا۔ اقبال اسی خاطر راہبانہ تصوف کو اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پوداٹھہراتے ہیں:

تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے ۔[۹۴]

اقبال مزید فرماتے ہیں:

تصوف کی تحریک غیر اسلامی عناصر سے خالی نہیں اور میں اگر مخالف ہوں تو صرف ایک گروہ کا جس نے محمد عربیؐ کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے جو مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ [۹۵]

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا کہ راہبانہ تصوف اسلامی دنیا میں تقریباً دوسری تیسری صدی ہجری میں نفوذ کر گیا محققین ومورخین اس حوالے سے مختلف آراء نظریات رکھتے ہیں مگر اکثر و بیشتر کا اتفاق رائے اس نکتے پہ ہیں کہ تصوف دوسری صدی ہجری میں اسلامی دنیا میں وارد ہوا۔ اقبال بھی اسی خیال کے حامی ہے وہ کہتے ہیں:

تصوف کا لفظ ہی رسول اللہؐ کے زمانے میں موجود نہ تھا ۱۵۰ ھ میں یہ لفظ پہلے پہل استعمال ہوا ... سرچشمہ اسلام یعنی قرآن حدیث تصوف کے لفظ تک سے نا آشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا ... تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں جو لوگ تارک الدنیا اور گوشہ گیر ہوکر عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے تھے ان کو عام لوگ صوفی کے لقب سے پکارنے لگے۔ [۹۶]

راہبانہ تصوف کے جو بنیادی عقائد و اصول ہیں ان میں عقیدہ وحدت الوجود اور ترک علائق دنیوی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ وحدت الوجود کے مطابق وجود مطلق یعنی ذات باری کے سوا اس ہستی میں کسی شے کا کوئی واقعی وجود نہیں ہے تمام اشیاء اور ساری کائنات بس صرف حق تعالیٰ کے اسماء وصفات کے گوناگوں مظاہر ہیں۔ اس عقیدے کے مطابق ذات باری اور یہ

ہستی ایک دوسرے کی عین ذات ہیں جن میں دوئی یا ثنویت کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے ۔اس طرح یوں انسانی ذات اور شخصیت کی نفی لازمی بننے کے ساتھ خودی و اثبات خودی ایک امر باطل ٹھہرتا ہے۔ وحدت الوجود کے نقطۂ نظر سے انسانی ذات وشخصیت اور خودی موہومات کے سوا کچھ نہیں ہیں کیونکہ ان کا تعلق مشہودات سے ہیں نہ کہ حقیقت کے ساتھ، حقیقت اشیاء کے باطنی پہلو پر مشتمل ہے نہ کہ ظاہری صورت پر۔بقول اقبال:

> رہبانی تصوف کا نشو ونماء ... رفتہ رفتہ غور وفکر تک محدود رہ گیا... یوں بھی جہاں تک تصوف کے ظنی پہلو کا جس کا آگے چل کر نشو ونماء ہوا تعلق ہے وہ آزاد خیالی ہی کی ایک شاخ تھااور اس لیے عقلیت کا حلیف۔اس نے ظاہر و باطن پر زور دیااور اس طرح ہر اس چیز سے جس کا تعلق حقیقت کی بجائے مشہودات سے تھا کنارہ کشی کرلی۔ [۹۷]

نفی خودی اور خارجی حقائق و اشیاء سے منہ موڑنے کی تلقین وتصریح جو رہبانی تصوف کا طرہ امتیاز ہے کے اثر سے مسلمانو ں نے دنیا اور علائق دنیا سے احتراز کیا۔ اس احتراز کے پیچھے اس حقیقت کا کافی عمل دخل تھا جس کا تعلق انسان کی فناء ذات اور نجات کے اہم صوفی مسئلے سے ہیں۔ اکثر وبیشتر رہبانی صوفیا کا یہ عقیدہ رہا ہیں کہ انسان کو دنیا اور اس کی مجموعی سرگرمیوں ، اس کی لذات، مسرتوں اور جھمیلوں سے اپنے آپ کو نجات دے کر ذات مطلق میں اپنے آپ کو فنا کر کے ہی اس مکروہ و مذموم دنیا سے نجات ملے گی۔ دنیا ان کی نظر میں ہر رنج و مصیبت ، ذلت و رسوائی اور روحانی تنزل و انحطاط کی وجہ بن کر انسان کو ابدی سکون وسکوت اور سرمستی سے باز رکھتا ہے۔ اس لیے انسان کو معاشرے سے قطع تعلق کر کے اپنے تزکیہ باطن او رصفائے قلب کے لیے انسانوں سے دور رہ کر کسی مناسب جگہ خو دسوزی اور مراقبے ومشاہدے ومحاسبے سے سروکار رکھنا چاہیے۔ اس غیر تمدنی (Anti Social) نظریے کے جو بھیا نک نتائج نکلے ان کے متعلق مولانا مودودی کا بیان ہے:

یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک اور پاک باز افراد کو دنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لے جاتی ہے اور بدترین قسم کے شریر افراد کے لیے میدان صاف کردیتی ہے۔ بدکار لوگ خدا کی سرزمین کے متولی بن کر آزادی کے ساتھ فساد پھیلاتے ہیں اور نیک لوگ اپنی نجات کی فکر میں تپسیا کیے چلے جاتے ہیں۔ اس جاہلیت کے اثرات جہاں تک عوام میں پہنچتے ہیں وہ ان کے اندر غلط قسم کا صبر و تحمل اور مایوسانہ نقطۂ نظر پیدا کر کے انھیں ظالموں کے لیے نرم نوالہ بنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ، امرا اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے رہے ہیں اور یہ خوب آرام سے ان کی سرپرستی میں پھیلتا ہے۔ تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ امپیریلزم، سرمایہ داری اور پاپائیت سے اس راہبانہ فلسفہ واخلاق کی کبھی لڑائی ہوئی ہو۔[۹۸]

راہبانہ تصوف یا بقول مولانا مودودی راہبانہ جاہلیت کے مذکورہ بالا حقائق اور خصائص کی منظرکشی اقبال نے جاوید نامہ میں ''آزمایش کردن اہرمن زرتشت را'' نامی نظم میں کی ہے۔ اس میں اہرمن یعنی ابلیس زرتشت کو جو رسالت اور قوت عمل کا پیکر ہے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم راہبانہ زندگی کو اختیار کرو جو لقا اللہ، خلوتوں اور سراسر قدسی سرمستیوں کی زندگی ہیں اور اس دنیائے دوں کو جو اشرار کی آماجگاہ ہیں چھوڑ دو:

اہرمن

شہر را بگذار و درغارے نشیں
ہم بہ خیل نوریاں صحبت گزیں

(ترجمہ: ابلیس زرتشت سے کہہ رہے ہیں کہ تم شہر کو چھوڑ کر کسی غار میں پناہ لو اور نوری مخلوقات کے ساتھ صحبت اختیار کر۔)

از نگاہے کیمیا کن خاک را
از مناجاتے بسوز افلاک را

(ترجمہ: اپنے روحانی کمالات سے خاک کو گوہر بنانے کی کرامتیں وہاں دکھا اور اپنی مناجاتوں کی تپش سے آسمانوں کو دہلا دے۔)

لیکن از پیغمبری باید گذشت
از چنیں ملا گری باید گذشت

(ترجمہ: مگر تجھے اس رسالت کے منصب سے یعنی حکومت اجتماع سے دور رہنا چاہیے،اس طرح کی ملا گری سے تمہیں کیا واسطہ۔)

کس میان ناکساں ناکس شود
فطرتش گر شعلہ باشد خس شود

(ترجمہ: کیونکہ اگر کوئی کامل آدمی جو کہ تم اے زرتشت ہو ناکس دنیا والوں کے ساتھ رہو گے تم بھی انہیں کی طرح ہو جاؤ گے۔تمہاری نوری فطرت ان سفلی لوگوں کے ساتھ کثیف ہوجائے گی۔)

خیز و در کاشانہ وحدت نشیں
ترک جلوت گوے و در خلوت نشیں[99]

(ترجمہ: اٹھ اور اس دنیا کو ترک کرکے کاشانہ وحدت (وحدت الوجود) کی بارگاہ الٰہی میں پناہ لیکر جلوت کی اس پست دنیا سے خلوت کی قدسی و اخروی دنیا میں فروکش ہوجاؤ۔)

رسالت (یعنی دین و شریعت) افراد کو استکبار و طاغوتیت کے خلاف مزاحمت و مقاومت کا درس دیتی ہے۔ دینی مفاہیم میں دنیا انسان کے لیے معنوی طور پر ذلت و مسکنت اور تباہی و بربادی کا باعث نہیں بنتا ہیں ، بلکہ اسلامی معارف کی رو سے دنیا انسان کے تمام معنوی و روحانی عروج و کمالات کا پیش خیمہ ہے۔ اسلام دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیتا ہے دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دے کر اسلام تمام انسانوں اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے یہ نکتہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ عمل ،مزاحمت و مقاومت ہی میں راز حیات پوشیدہ ہے اور اس کے بغیر زندگی لایعنی(Absurd) ہے۔ رہبانیت اور رہبانی تصوف جو عمل ،مزاحمت و مقاومت کا بنیادی دشمن ہے کی پیامبر اسلام ؐ کے اس ارشاد گرامی سے قطعی طور پر بنیاد ہی منہدم ہوتی ہے:

فانی لست امرکم ان تکو نو قسیسین ورھبانا۔ [۱۰۰]

(ترجمہ: میں تمہیں صوفی و درویش اور راہب و تارک دنیا بننے کا حکم دینے نہیں آیا۔)

طاغوت و استکبار رہبانی تصوف کی آڑ میں اپنے ابلیسی و شیطانی مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے امت اسلامیہ کے جہادی و مزاحمتی عنصر کے سرچشمے یعنی شریعت کو منسوخ و ضعیف کر کے اس کی بیخکنی کرتے آیا ہے اور کرنا چاہتے ہیں ۔اقبال کو اسی سبب سے رہبانی تصوف کے ساتھ بڑی کدتھی۔"ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں وہ ابلیس سے اس رہبانی پروجیکٹ کی بازیافت و بازگوئی اس طرح کرواتے ہیں کہ صاف وشفاف طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابلیسی و شیطانی تمناؤں کی تعبیر مسلمانوں کی فلج زدگی اور جوش کردار سے عاری ہونے میں چھپی ہے اور فلج زدگی و جوش کردار سے محرومی رہبانی تصوف کا طرہ امتیاز ہے:

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپادے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر وفکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے [۱۰۱]

جہاد و مقاومت دفاعی ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی نوعیت کا بھی ہے اور دفاعی ومزاحمتی جد و جہد کی کامیابی کا انحصار تخلیقی نوعیت کے جہاد پر ہے ۔تخلیقی جہاد انسان کو تخلیق و تولید کے مقاصد کی ایک نئے سے نئی دنیا سے ہمکنار کرنے کے لیے خودی سے قوت وعزم پاتا ہے اور امت خودی کی تخلیقی توانائی سے اس قابل ہوتی ہے کہ امت کی حریم کو اس کے درونی و بیرونی دشمنوں کے شر وگزند سے محفوظ رکھ سکیں، مگر رہبانی تصوف اس خودی جو عشق وعقل اور علم وعمل

کے ایک خوشگوار ومتوازن وجود اور سنگم کا نام ہے کا موذی دشمن ثابت ہوا۔ اسی خاطر اقبال اس تصوف کو آفت خودی ہونے کی وجہ سے ایک بے وقعت شے قرار دیتے ہیں جو کسی کام کا نہیں۔

رہبانی تصوف کے فکری و عملی انتشار کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کو کلامی خلفشار اور موشگافیوں نے بھی کافی نقصان پہنچایا۔علم کلام اسلامی عقائد ونظریات کو تحلیلی و تجزیاتی طریقے سے بحث و جدل کی کسوٹی پر پرکھ کر ان عقائد ونظریات کو دیگر غیر اسلامی عقائد کے تہاجم اور شبہہ افگنیوں سے بچا کر ان کے اثبات کو یقینی بناتا ہے۔علم کلام کا اساسی کام اور وظیفہ اسلامی عقائد کو علمی ،عقلی ونقلی بنیادوں پر تحفظ فراہم کر کے انہیں دیگر ادیان و مذاہب کے اعتقادی اثر و نفوذ اور یلغار سے بچانا ہے۔ اس کے علاوہ علم کلام اسلامی عقائد کی عقلی وعلمی برتری کو دیگر ادیان و مذاہب کے عقائد ونظریات پر ثابت کرنے کے لیے ایک موثر ذریعہ رہا ہے ۔ جہاں تک اس علم کی تاریخی قدامت کا تعلق ہے اس حوالے سے مورخین ومحققین کہتے ہیں کہ قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اسلامی معاشرے میں کب کلامی ابحاث نے زور پکڑا۔ البتہ یہ واضح ہے کہ پہلی صدی ہجری میں کلامی ابحاث نے ایک باقاعدگی اختیار کر لی تھی۔بقول استاد شہید مرتضٰی مطہری:

> علم کلام کے آغاز اور مسلمانوں میں اس کے رواج کی ابتدا کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دی جاسکتی لیکن اتنا مسلم ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف دوم میں جبرو اختیار اور عدل جیسے کچھ کلامی مسائل مسلمانوں کے درمیان موضوع بحث بنے ہوے تھے،اور شاید ان بحثوں کی پہلی باقاعدہ درسگاہ حسن بصری (وفات ۱۱۰ھ) کی درسگاہ ہے۔پہلی صدی ہجری کے نصف دوم میں '' معبد جہنی'' اور ''غیلان دمشقی'' نامی دو شخصیتیں مسلمانوں کے درمیان گزری ہیں ،جنھوں نے انسان کی آزادی اور اس کے با اختیار ہونے کی بڑی شدت سے حمایت کی ہے لیکن ان کے مقابلہ میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جو عقیدہ جبر کے قائل تھے،آزادی و اختیار کے حامی ''قدری'' اور اس کے مخالف'' جبری'' کے نام سے مشہور ہوئے۔رفتہ رفتہ ان دونوں گروہوں

کے اختلافات بڑھتے گیے اور ان کا سلسلہ الٰہیات ،طبیعیات ،اجتماعیات اور پھر انسان و معاد سے مربوط کچھ مسائل تک پہنچ گیا اور جبر و اختیار کا مسئلہ ان اختلافی مسائل کا ایک گوشہ تھا۔ ان ادوار میں قدریوں کو ''معتزلہ'' اور جبریوں کو ''اشاعرہ'' کے نام سے یاد کیا گیا۔[۱۰۲]

معتزلہ و اشاعرہ اور کئیں دیگر کلامی فرقے کلامی مباحث میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھنے کی صورت میں وجود میں آگیے۔ ان اختلافات کی خلیج امتداد زمانہ کے ساتھ وسیع ہوتی گئی جس کے نتیجے میں ان کلامی فرقوں کے اکابرین و مشاہیر کے درمیان آپسی مخاصمت و بدظنی نے کافی زور پکڑ لیا۔ یہی علم کلام اور کلامی مسائل کا منفی پہلو قرار پاتا ہے کیونکہ مخاصمت و بدظنی کا یہ پہلو مسلمانوں میں اعتقادی انتشار و خلفشار کے ساتھ ساتھ اجتماعی و سیاسی پراکندگی کا باعث بنا۔ جہاں تک اعتقادی انتشار و پراکندگی کا سوال ہے علامہ شبلی نعمانی اس حوالے سے اسلام کے دو بڑے کلامی فرقوں معتزلہ واشاعرہ کے باہمی اختلافات کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

اشعریہ	معتزلہ
کوئی شے فی نفسہ اچھی یا بری نہیں شارع جس چیز کو اچھی کہہ دیتا ہے اچھی ہو جاتی ہے اور جس کو بری کہتا ہے بری ہو جاتی ہے۔ خدا محالات کا حکم دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔ خدا کو عدل اور انصاف کرنا ضروری نہیں۔ خدا عبادت کے عوض میں عذاب دے سکتا ہے اور گناہ کے بدلے میں انعام۔ اور اگر وہ ایسا کرے تو ناانصافی نہیں ہے۔	ہر شے پہلے سے اچھی یا بری ہے شارع اسی چیز کو اچھی کہتا ہے جو فی نفسہ اچھی تھی اور اسی چیز کو بری کہتا ہے جو پہلے سے بری تھی۔ خدا کسی محال چیز کا حکم نہیں دے سکتا۔ ضروری ہے۔ خدا کبھی ایسا نہیں کر سکتا ایسا کرے تو یہ ظلم اور نا انصافی ہے۔[۱۰۳]

معتزلہ و اشاعرہ کے کلامی عقائد کا یہ مقایسہ ان کے شدید اختلافات کو پوری طرح واضح کرتا

ہے۔ ان اختلافات نے عام مسلمانوں کو اعتقادی ونظریاتی سطح پر ایک شدید بحران سے دوچار کردیا۔ عقائد کے اس نظریاتی اختلاف و بحران نے امت مسلمہ کی باہمی وحدت و اخوت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ ایک فرقے کے حامی دوسرے فرقے کے حامیوں کے ساتھ بارہا لڑ کر ایک دوسیرے کی تکفیر کرنے لگے جس کا نتیجہ قتل و غارتگری اور فتنہ وآشوب کی صورت میں برآمد ہوا۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس ناگفتہ بہ صورتحال کا کچھ یوں تذکرہ کیا ہے:

> افسوس یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ سے جس مسئلہ میں مختلف تھا ، اسی کو اسلام و کفر کی حد فاصل قرار دیتا تھا،مثلاً مسائل اختلافیہ میں ایک یہ بھی تھا کہ کلام الٰہی قدیم ہے ،یامخلوق و حادث؟ معتزلہ کہتے تھے کہ کلام الٰہی جو خدا کی صفات قدیمہ میں ہے وہ قدیم ہے،لیکن جو الفاظ آنحضرتؐ پر نازل ہوئے تھے وہ مخلوق اور حادث تھے،محدثین کہتے تھے کہ کلام الٰہی ہر حال میں قدیم ہے،زیادہ تدقیق سے دونوں کا حاصل ایک ہی ٹھہرتا ہے،لیکن دونوں فرقہ نے اس مسئلہ کو کفر و اسلام کی حد فاصل قرار دیا۔[۱۰۴]

کلامی مسائل سے اس پیدا شدہ تکفیری صورت حال نے امت کی وحدت کا شیرازہ بکھیر دیا جس سے داخلی و خارجی سطح کی اسلام دشمن طاقتوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔اعتقادی و اختلافی مسائل کے اس خلفشار نے عالم اسلام میں بنو امیہ و بنو عباس وغیرہ کی مستبد و آمر حکومتوں کو راحت و چین سے امت پر ظلم وستم ڈھانے کا موقع فراہم کردیا۔کیونکہ جب مسلمان آپسی اختلافات کی شورشوں میں لگ گیے نتیجے میں وہ ان حکومتوں کی غیر عادلانہ پالیسیوں اور مظالم سے یکسر غافل ہوگیے، اس کے علاوہ ایسی حکومتیں اپنے سیاسی مفادات کی خاطر کسی نہ کسی فرقے کی ہر ممکنہ ذریعے سے حمایت یا سرکوبی میں اپنا فعال کردار ادا کرتی تھیں۔ امت اختلافات کی اس بھٹی میں جھلس رہی تھی کہ ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں نے جہان اسلام پر دھاوا بول کر اس کو تاراج کرکے رکھ دیا۔ تاتاریوں نے مجموعی طور پر سیاسی ،ثقافتی و اجتماعی سطح پر مسلمانوں کے اقتدار کو ملیا میٹ کر دیا۔ جو اسلامی دنیا ساتویں صدی ہجری تک سارے جہاں میں ایک سپر پاور

کی حیثیت سے بر سر اقتدار تھی وہ تا تاری یورش کے بعد اب تک دوبارہ اس عظمت اور شوکت وکو حاصل نہ کر سکی۔یہی کلامی فتنہ انگیز موشگافیاں تھیں کہ صلیبی طاقتیں عالم اسلام پہ چڑھ دوڑی جو آج تک پورے عالم اسلام پہ کسی نہ کسی صورت میں مسلط ہے۔ان دردناک حوادث کی وجہ ملت کی عدم وحدت اور پراکندگی میں مضمر دکھائی دیتی ہے جس کے پیچھے انہیں کلامی اختلافات کا تانا بانا بالآخر نظر آتا ہے۔ اقبال شاید انہیں حقائق کے پیش نظر علم کلام کو افیون سے مشابہہ ٹھہراتے ہیں کیونکہ اس نے مسلمانوں کو اسلام اور عالم اسلام کے اصلی مسائل سے ہی یکسر غافل کر دیا۔ اس غفلت کا نتیجہ بڑا ہی تباہ کن نکلا یہ تباہی داخلی و خارجی استکبار نے مسلمانوں کو پراکندہ دیکھ کر ان پر ڈھادی اور ابلیس کے یہ استکباری مرید اسی تاک میں ہیں کہ امت کو کلامی اختلافات میں الجھا کر آسانی کے ساتھ اسکی ریشہ کنی کر دیں:

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں "علم کلام"
ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے؟
ہیں صفات ذات حق ، حق سے جدا یا عین ذات؟
آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے
یا مجدد ،جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوے لات ومنات؟[105]

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

کلامی مناقشات ومجادلات کے تخریبی پہلو کو جو امت مسلمہ کے خلفشار چاہیے وہ سیاسی ہو یا اجتماعی کو چھوڑ کر امت مسلمہ کو علم کلام کے مثبت پہلو کو اختیار کرنا چاہیے جو انہیں علمی وعملی سطح

پر ایسی بصیرت سے نواز سکتا ہے جس سے امت کی عظیم عقلانی صلاحیتیں اسلام کی برتری اور وحدت امت میں بحسن خوبی کام آسکتیں ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ مغرض عناصر کلامی تنازعات کو فروغ دے کر مذکورہ صلاحیتوں و امکانات کو ابلیسی اہداف و مقاصد میں صرف کرتے ہیں۔

اقبال کے نقطۂ نگاہ سے حسی عقلیت پرستی ، نژاد پرستی ، وطنیت ، ملوکیت، سرمایہ داری ، اشتراکیت، سیکولرازم و سیکولر جمہوریتیں، مادی تہذیب، استعمار، تقدیر پرستی ، رہبانیت اور کلامی مناقشات میں ابلیس اور ابلیسیت کی معنوی جھلکیں جلوہ گر ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنی اصالت کے پیش نظر خالصتاً ابلیس کے مظاہر ہیں جیسے نژاد پرستی ، تقدیر پرستی وغیرہ اور کچھ اپنے سلبی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ابلیس کے معنوی مظاہر میں اپنی جگہ بناتے ہیں جیسے اشتراکیت و رہبانی تصوف وغیرہ۔ ابلیس اپنے ان مظاہر کے ذریعے آدم سے برسر پیکار ہے۔ اس کے یہ مظاہر دراصل انسانی اعمال و افعال واعتقادات کی منفیت اور منفی حیثیت و ہئیت کو ظاہر کرتے ہیں؛ جو اپنے منطقی انجام کے پیش نظر ابلیسی افعال و اعمال کے ساتھ منتج ہوں گے اور وہ نتیجہ دائمی و اخروی تباہی و ناکامی کی صورت میں نکلے گا۔ ابلیس اپنے ان مظاہر کے طفیل آدم کو بڑی آسانی کے ساتھ مغلوب کرتے آیا ہے۔ وہ ہر سطح پر انسانوں کی اکثریت کو اپنی حرکت پذیری ، جدوجہد، صلابت و استقامت ، حسن تدبیر، معاملہ فہمی، دانش و بینش اور بیداری و بصیرت وغیرہ سے شکست و ریخت کا دوچار کر کے اپنا صید زبوں بناتے آیا ہے۔ اقبال کے بقول ابلیس ضعیف و ناتواں انسانوں کی اکثریت کو مغلوب کرنے میں کچھ لطف و کیف نہیں پاتا اس لیے وہ خدا سے کہتا ہے کہ مجھے اس انسان کی صحبت سے نجات دے جو ذلت و رسوائی کی ایسی اتھاہ گہرائی میں اسیر ہوا ہے کہ خود مجھے بھی شرم آنے کے ساتھ اس پہ رحم آتا ہے ،اس لیے وہ خدا سے ملتجی ہے کہ مجھے انسان کی صحبت سے نجات دے کیونکہ میں اس کی معیت میں روسیاہ سے روسیاہ تر ہو رہا ہوں۔ اقبال ابلیس کے اس اعتذار کو بڑی خوبی کے ساتھ یوں ادا کرتے ہیں:

اے خدا وند صواب و ناصواب
من شدم از صحبت آدم خراب

(ترجمہ: ابلیس کہتا ہے اے خدائے صواب و ناصواب میں آدم کی صحبت سے خراب ہو چکا ہوں۔)

ہیچ گہ از حکم من سر بر نتافت
چشم از خود بست وخود را در نیافت

(ترجمہ: آدم نے کبھی بھی میرے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی ہر وقت میرا تابع فرماں ہے اس نے اپنے آپ کو بھلا کر اپنے آپ کو کھو دیا یوں اپنی شناخت سے محروم ہے۔)

خاکش از ذوق 'ابا' بیگانہ
از شرار کبریا بیگانہ

(ترجمہ: آدم کی سرشت انکار کونہیں جانتی ہے بس یہ میرا فرماں پذیر ہے کیونکہ یہ خدا کی معرفت سے بالکل بیگانہ ہے۔)

پست از و آں ہمت والاے من
واے من ،اے واے من،اے واے من

(ترجمہ: میری وہ عظیم ہمت جس کے لیے میں جانا جاتا ہوں اس کی وجہ سے پست ہوگئی ہے اس پستی کے حوالے سے مجھ پر حیف و واے ہو۔)

بندہ صاحب نظر باید مرا
یک حریف پختہ تر باید مرا

(ترجمہ: اے خدا اپنے کسی دیدہ ور بندے کو میرے مقابلے پر بھیج جو میرا ہم پلہ وحریف ہو۔)

اے خدا یک زندہ مرد حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست[۱۰۶]

(نالہ ابلیس)

(ترجمہ:اے خدا وہ ایسا کوئی حق پرست وحق شناس مرد ہو جس کے ساتھ پنجہ آزمائی کر کے مجھے شکست ہو اور وہ شکست شاید میرے لیے باعث لذت ہو۔)

ابلیس اس مرد حق پرست اور اس حق پرست کے آئین جواں مردی کا تعارف خود ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں کراتا ہے کیونکہ یہ مرد حق پرست اور اسکا آئین ابلیسی مقاصد و مظاہر کا قلع قمع کرتا ہے:

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
کرتاہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہونہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن ،مرد آزما،مرد آفریں[۱۰۷]

یہ مرد حق پرست یعنی مومن واقعی ابلیس کو دعوت حق دیتا ہے جو اسے اس جہان ناچیز کی بے وقعتی کا درس دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ مرد مومن و دیدہ ور ابلیس کو ایک منصفانہ نبرد کی دعوت دیتا ہے ایک ایسی نبرد کی جو دونوں کو اس دنیا سے نجات دلا کر ایک ایسی نئ دنیا کا پیش خیمہ بنے جو ہر حوالے سے مثالی ہو اور جو اس دنیا کی یکسانیت و یک نواختی سے بالکل منزہ ہو جس کا ہر لحظہ ایک نئے سے نئے دنیا کا سراغ ہو:

بیا تا نرد را شاہانہ بازیم
جہان چارسو را در گدازیم
بافسون ہنر از برگ کاہش
بہشتے ایں سوے گردوں بسازیم[۱۰۸]
(بگو ابلیس را)

(ترجمہ:اے ابلیس آ ہم دونوں مل کر زندگی کی شطرنج بازی کو بڑے شاہانہ انداز میں کھیلتے ہیں۔اور یوں اس کائنات کو پگھلا دیتے ہیں کیونکہ تو بھی سوز و گداز کا پیکر ہے اور میں بھی۔ہنر کے جادو سے ہم گھاس کے تنکے سے آسمان کے اس طرف یعنی دنیا میں بہشت

بناتے ہیں ،اپنے علم و ہنر کی صلاحیت سے ایک ایسی جنت بناتے ہیں جو خدا کی اس جنت کے غم کو کچھ غلط کر سکیں۔)

یہی مرد مومن وحق بیں دنیا کو یہ پیغام دیتا ہے کہ ابلیس کو مارنا اور اسے مغلوب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ وہ انسان کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔صرف ایک راہ ہے جس سے اسے مغلوب کیا جا سکتا ہے ، وہ راہ یہ ہے کہ اسے مسلمان بنا کر قرآن کی شمشیر سے زیر کیا جائے۔اقبال کی باتوں سے یہ نکتہ مترشح ہوتا ہے کہ اسلام کے بغیر دنیا کے لیے ابلیس وابلیسیت پہ غلبہ پانا محال ہے۔ بقول ان کے:

کشتن ابلیس کارے مشکل است
ز انکہ اوگم اندر اعماق دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی[109]

(حکمت خیر کثیر است)

(ترجمہ: ابلیس کو مارنا ایک مشکل کام ہے کیونکہ وہ ہمارے رگ وپے میں رہتا ہے۔بہتر یہی ہوگا کہ اسے مسلمان بنا کر قرآن کی شمشیر سے زیر کرلو۔)

حوالہ جات

۱۔ مولانا جلال الدین محمد بلخی،مثنوی معنوی،جلد۲،انتشارات دوستان،خیابان انقلاب، خیابان فخر رازی،تہران ایران،۱۳۹۲ھ ش،ص،۲۷۱،۲۷۲۔

۲۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۵۷۷۔

۳۔ قرآن،(تاج کمپنی لاہور)علیم بک ڈپو،نئی دہلی،سنہ ندارد،سورہ نحل ،آیت۱۲۔

۴۔ امام غزالی،احیاء العلوم الدین،جلد۳،فاروقیہ بک ڈپو،دہلی،سنہ ندارد،ص،۱۲۔

۵۔ محمد شریف بقا،خطبات اقبال ایک جائزہ،گلشن پبلشرز ،مدینہ چوک سرینگر،کشمیر،۱۹۹۴ء،ص،۱۶۔

۶۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۴۴۴۔

۷۔ Simon Blackburn,The Oxford Dictionary of Philosophy,Oxford University press,New york,2008,pg,114.

۸۔ ڈاکٹرعشرت حسن انور،اقبال کی مابعد الطبیعیات،،گلشن پبلشرز ،گاوکدل چوک سرینگر، کشمیر، ۱۹۹۱-۹۲ء،ص،۵۱۔

۹۔ استاد شہید مرتضیٰ مطہری،فطرت،انتشارات صدرا،قم ایران،۱۳۹۵ھ ش،ص،۱۶۶۔

۱۰۔ قرآن،(تاج کمپنی لاہور)علیم بک ڈپو،نئی دہلی، سنہ ندارد، سورہ جاثیہ، آیت۲۴۔

۱۱۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۸۱۷۔

۱۲۔ کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈسنز ، لاہور پاکستان،سنہ ندارد،ص،۹۲،۹۳۔

۱۳۔ ایضاً،ص،۵۴۰،۵۴۱۔

۱۴۔ ایضاً،ص،۸۴۰۔

۱۵۔ محمد قطب، اسلام اور جدید مادی افکار،مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی،۱۹۹۰ء،ص،۹۴،۹۵۔

۱۶۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۳۴۹۔

۱۷۔ Simon Blackburn,The Oxford Dictionary of Philosophy,Oxford University press,New York,2008,pg,305.

۱۸۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور پاکستان، سنہ ندارد، ص،۲۵۵،۲۵۶۔
۱۹۔ سید مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیب اقبال، جلد۲، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص،۲۳۳،۲۳۴۔
۲۰۔ قرآن، (تاج کمپنی لاہور) علیم بک ڈپو، نئی دہلی، سنہ ندارد، سورہ حجرات، آیت ۱۳۔
۲۱۔ شکیل شفائی، اکیسویں صدی میں فکر اقبال کی معنویت، وین گارڈ پبلکیشنز سرینگر، کشمیر، ۲۰۰۶ء، ص، ۳۸۔
۲۲۔ Britannica Ready Reference Encyclopedia,vol 7 , Encyclopedia Britannica,(India), New Delhi,2005,pg,74.
۲۳۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ، زندہ رود، علمی اکیڈیمی، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء ص، ۵۴۵۔
۲۴۔ کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص، ۱۱۷۔
۲۵۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ، مے لالہ فام، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۲۳۶۔
۲۶۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور پاکستان، سنہ ندارد، ص، ۱۱۲۔
۲۷۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی، نقوش اقبال، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو، ۲۰۰۲ء، ص، ۲۴۶۔
۲۸۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور پاکستان، سنہ ندارد، ص، ۱۱۶۔
۲۹۔ علامہ اقبال، خطبات اقبال (ترجمہ وحواشی محمد جہانگیر عالم)، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص، ۹۰، ۹۱۔
۳۰۔ کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص، ۲۲۷، ۲۲۸۔
۳۱۔ علامہ اقبال، خطبات اقبال (ترجمہ وحواشی محمد جہانگیر عالم)، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص، ۱۹۔
۳۲۔ کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص، ۸۶۷۔
۳۳۔ قرآن، (تاج کمپنی لاہور) علیم بک ڈپو، نئی دہلی، سنہ ندارد، سورہ یوسف، آیت ۴۰۔
۳۴۔ ایضاً ص، سورہ اعراف، آیت ۵۴۔
۳۵۔ کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص، ۸۱۷۔
۳۶۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ، مے لالہ فام، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص، ۱۷۸، ۱۷۹۔
۳۷۔ کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص، ۸۵۵۔
۳۸۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور پاکستان، سنہ ندارد، ص، ۹۱۷۔
۳۹۔ ایضاً ص، ۸۱۱۔

۴۰۔ ایضاً،ص،۶۵۲۔

۴۱۔ ایضاً،ص،۶۵۳۔

۴۲۔ ایضاً،ص،۹۷۲۔

۴۳۔ سید مظفر حسین برنی،کلیات مکاتیب اقبال،جلد۲،اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۰ء،ص،۴۵۴۔

۴۴۔ استاد شہید مرتضٰی مطہری،اسلامی اقتصاد کا ایک جائزہ،سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی ادارہ ترجمہ واشاعت، تہران، ۱۴۱۷ھ،ص،۱۱۴۔

۴۵۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)،کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۳۷۱،۳۷۲۔

۴۶۔ کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور پاکستان،سنہ ندارد،ص،۳۸۵۔

۴۷۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)،کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء ،ص،۴۱۵۔

۴۸۔ کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور پاکستان،سنہ ندارد،ص،۳۷۵۔

۴۹۔ Ania Loomba,Colonialism/post colonialism,Routledge taylor and francis group,london and new york,2013,p,110.

۵۰۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی،اسلام اور جدید معاشی نظریات،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،نئ دہلی، ۲۰۰۵ء،ص،۳۹۔

۵۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، پردہ ، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،نئ دہلی، ۲۰۱۱ء،ص،۴۹،۵۰۔

۵۲۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)،کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۸۱۷۔

۵۳۔ کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور پاکستان،سنہ ندارد،ص،۳۸۶۔

۵۴۔ ایضاً،ص،۳۸۶،۳۸۷۔

۵۵۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)،کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۶۹۷۔

۵۶۔ ایضاً،ص،۸۲۱،۸۲۴۔

۵۷۔ سید مظفر حسین برنی،کلیات مکاتیب اقبال، جلد۲، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۰ء،ص،۴۵۳،۴۵۴۔

۵۸۔ محمد قطب،اسلام اور جدید ذہن کے شبہات،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز ،نئ دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۳۲۱۔

۵۹۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم،فکر اقبال،دارالاشاعت مصطفائی دہلی،۲۰۱۴ء،ص،۱۹۹۔

۶۰۔ مولانا سید ابواعلیٰ مودودی،اسلام اور جدید معاشی نظریات،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،نئی دہلی، ۲۰۰۵ ء،ص،۵۶۔

۶۱۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)،کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۷۰۰۔

۶۲۔ کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈسنز ، لاہور پاکستان،سنہ ندارد،ص،۸۱۴،۸۱۵۔

۶۳۔ ایضاً،ص،۶۵۲،۶۵۳۔

۶۴۔ ایضاً،ص،۶۵۳۔

۶۵۔ علامہ اقبال،تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،عشرت علی ناصری برائے اسلامک بک سینٹر نئی دہلی،۱۹۹۲ء،ص،۳۰۴،۳۰۵۔

۶۶۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، افکار اقبال(تشریحات جاوید)، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۱۵ء، ص،۱۲۱،۱۲۲

۶۷۔ علامہ اقبال،تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،عشرت علی ناصری برائے اسلامک بک سینٹر نئی دہلی،۱۹۹۲ء،ص،۲۵۸،۲۵۹۔

۶۸۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)،کتابی دنیا،دہلی،۲۰۰۴ ص،۶۲۵۔

۶۹۔ ایضاً،ص،۸۵۷۔

۷۰۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ، مے لالہ فام،اقبال اکادمی پاکستان،۲۰۰۳ء،ص،۳۰۴،۳۰۵۔

۷۱۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)،کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۶۱۹۔

۷۲۔ ایضاً،ص،۲۷۴۔

۷۳۔ ایضاً،ص،۸۲۰۔

۷۴۔ ایضاً،ص،۳۷۰۔

۷۵۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈسنز، لاہور پاکستان، سنہ ندارد،ص،۵۵۹،۵۶۰۔

۷۶۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم،فکر اقبال،دارالاشاعت مصطفائی دہلی،۲۰۱۴ء،ص،۲۲۶۔

۷۷۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص، ۷۸۰۔

۷۸۔ ایضاً ص، ۷۸۱۔

۷۹۔ علامہ سید مجتبیٰ موسوی لاری، مغربی تمدن کی ایک جھلک، سازمان تبلیغات اسلامی روابط بین الملللی، ایران، ۱۴۰۳ھ، ص، ۱۷۔

۸۰۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان، سنہ ندارد، ص، ۳۱۰۔

۸۱۔ Edward w said, culture and imperialism,vintage books london UK,1994, p,17.

۸۲۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص، ۷۸۳، ۷۸۴۔

۸۳۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور پاکستان، سنہ ندارد، ص، ۳۶۳۔

۸۴۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص، ۶۸۳، ۶۸۴۔

۸۵۔ استاد شہید مرتضیٰ مطہری، اسلامی علوم کا تعارف، سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی، تہران، ۱۴۱۷ھ، ص، ۱۷۹۔

۸۶۔ قرآن، (تاج کمپنی لاہور)، علیم بک ڈپو، نئی دہلی، سنہ ندارد، سورہ دھر، آیت ۳۔

۸۷۔ ایضاً، سورہ انعام، آیت ۳۹۔

۸۸۔ استاد شہید مرتضیٰ مطہری، اسلامی علوم کا تعارف، سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی، تہران، ۱۴۱۷ھ، ص، ۳۳۵۔

۸۹۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، عشرت علی ناصری برائے اسلامک بک سینٹر نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص، ۱۹۶، ۱۹۷۔

۹۰۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص، ۸۶۳۔

۹۱۔ ایضاً ص، ۶۵۰۔

۹۲۔ ایضاً ص، ۷۸۱۔

۹۳۔ ایضاً ص، ۴۹۰۔

۹۴۔ سید نذیر نیازی،حیات اقبال(دانائے راز)، اشرف بک ڈپو ریڈ کراس روڑسرینگر، کشمیر، ۲۰۱۴ء،ص،۳۵۲۔

۹۵۔ محمد شریف بقاء، اقبال اور تصوف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۳۶۔

۹۶۔ ایضاً،ص،۳۷۔

۹۷۔ علامہ اقبال،تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،عشرت علی ناصری برائے اسلامک بک سینٹر نئی دہلی،۱۹۹۲ء،ص،۲۵۲۔

۹۸۔ مولانا سید ابواعلیٰ مودودی،تجدید و احیاے دین،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،نئی دہلی،۲۰۰۸ء،ص،۱۷۔

۹۹۔ علامہ اقبال،کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈسنز، لاہور پاکستان، سنہ ندارد،ص،۶۳۷۔

۱۰۰۔ نقوش،(رسول نمبر)،جلد۸،ادارہ کتاب و الشفاء،کوچہ چیلان دریا گنج ،نئی دہلی، ۲۰۱۴ء،ص،۳۱۔

۱۰۱۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۸۲۹۔

۱۰۲۔ استاد شہید مرتضیٰ مطہری،اسلامی علوم کا تعارف،سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی، تہران،۱۴۱۷ھ،ص،۱۷۷،۱۷۸۔

۱۰۳۔ علامہ شبلی نعمانی،علم الکلام،دارالمصنفین شبلی اکیڈیمی اعظم گڈھ،۱۹۹۳ء،ص،۲۱،۲۲۔

۱۰۴۔ ایضاً،ص،۲۲۔

۱۰۵۔ کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)،کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۸۱۹،۸۲۸۔

۱۰۶۔ کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈسنز ، لاہور پاکستان، سنہ ندارد،ص،۲۵۷،۲۶۷۔

۱۰۷۔ کلیات اقبال اردو(مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)،کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء،ص،۸۲۶،۸۲۷۔

۱۰۸۔ کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈسنز ، لاہور پاکستان،سنہ ندارد،ص،۱۰۰۸۔

۱۰۹۔ ایضاً،ص،۶۶۳۔

تصور ابلیس اپنے سیر تکامل میں مختلف انسانی تمدنوں ، تہذیبوں اور ادیان میں گو نا گوں اشکال اور متنوع پیرائیوں میں موجود رہا ہے۔ کہیں پر یہ تصور ان تہذیبوں ، تمدنوں و ادیان کے حوالے سے غیر عقلی و غیر منطقی دکھائی دے رہا ہے تو کسی جگہ عقلی و منطقی خصائص کا حامل ۔ تاریخ بابل یا قدیم عراق کو انسانی تمدن کا پہلا گہوارہ تسلیم کرتی ہے جہاں اولین بار مختلف اجتماعی و سیاسی تصورات کی شکل گیری ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی و اعتقادی نظریات کی جو بابل کے نظام معاشرت میں مرکزی حیثیت کے حامل تھے کی داغ بیل بھی پڑ گئیں۔ ان مذہبی و اعتقادی تصورات ونظریات میں ان کا تصور ابلیس نمایاں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وہ امتداد زمانہ کے ساتھ اپنی طاقتور دیوی تیامت کو بحیثیت شیطان اس وقت ماننے لگے جب وہ بابل کے دوسرے بڑے دیوتاؤں جیسے مردوخ وغیرہ کی دشمنی پہ اتر آئی اور اس کے علاوہ ساری کائنات کو نیست و نابود کرنے پے تل گئی۔ بابلیوں کی طرح قدیم مصری بھی اپنی مذہبی و اعتقادی تاریخ کے ایک مرحلے پر اپنے ایک خاص دیوتا سیت یا سیتھ کو اس وقت شیطان کے بطور اپنے اعتقادی نظام میں جگہ دینے لگے جب اس کے ہاتھوں ان کے زرخیزی کے دیوتا اوزیرس کا قتل ہوتا ہے۔ یونانی و رومی تہذیب وتمدن اپنی اوائل عمری سے ہی مادی شعور اور مادہ پرستانہ فکری و عملی منہاج کے پیش نظر شہرہ آفاق رہے ہیں۔ مادہ پرستانہ زندگی کی وسوسہ انگیز اور مخمصہ خیز سرگردانیاں ان کے تصور شر و بدی اور تصور ابلیس میں بھی سرایت کیے ہوئے نظر آتی ہیں۔جس کے نتیجے میں وہ اپنے دیوتاؤں جیسے زیوس، اپالون وغیرہ کو عیاری و مکاری ، عیاشی و بدمعاشی اور ہر طرح کی کثافت کاری کے نمائندہ مظاہر جان کر انہی کو دیوتا ہونے کے ساتھ ساتھ شیطانی عوامل بھی گردانتے تھے کیونکہ یہ دیوتا منصۂ شہود پر کبھی اپنے مثالی رخ تو کبھی ابلیسی لباس میں ظاہر ہوتے تھے۔

مذاہب و ادیان میں تصور ابلیس کے حوالے سے دنیا کا ایک قدیم دیومالائی مذہب (Mythological Religion) ہندومت اپنی تاریخی قدامت کے لحاظ سے قابل توجہ ہے ۔ اس دیومالائی مذہب میں دیوی دیوتاؤں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہیں، جن میں نمایاں ترین

ویشنو اور شیوا وغیرہ ہیں جو برہما کے اوتار مانے جاتے ہیں۔ یونانی و رومی دیوتاؤں کی طرح ہند ومت کے دیوتا اور دیویاں بھی کبھی کبھار اپنے نیکی کے رخ کو چھوڑ کر شیطنت آمیز صورت اختیار کرتے ہیں، جس کو مدنظر رکھ کر یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اس دیومالائی مذہب میں بھی ابلیس کا کوئی مشخص تصور نہیں ملتا ہے۔ اس صورت حال کے باوجود راون اور اندھک آسر کے روپ میں اس مذہب میں ابلیسیت کے دو نمونے ملتے ہیں۔ اگر چہ وہ بھی اپنی اولین صورت میں دیوتا ہی ہیں۔ایرانی آریاؤں کی ثقافتی عظمت اور تاریخی قدامت کے ساتھ ساتھ ان کی اعتقادی انفرادیت بھی پوری دنیا پہ واضح ہے کیونکہ انہوں نے اپنی طویل مذہبی تاریخ کے کسی بھی مرحلے پر باضابطہ طور پر بت پرستی اختیار نہیں کی جو وحیانی مذاہب کے نقطۂ نظر سے ان کا ایک انفرادی وصف مانا جاتا ہے، مگر ہستی مطلق کے متعلق ان کا ثنوی (Dualistic) نقطۂ نظر ان کی اعتقادی حیرانی و سرگردانی کی بخوبی آئینہ داری کرتا ہے۔ اول اول زرتشتی مذہب ثنوی آلائشوں سے پاک و صاف ہوتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ زرتشتی تعلیمات مجوسی علماؤں کے ہاتھوں مسخ ہو کر ایک ثنوی شکل میں برآمد ہوتی ہے۔ جن کی رو سے اس کائنات کے دو خالق قرار پاتے ہیں؛ آہورا مزدا یا یزدان نیکی اور خیر و صفا کا خالق متصور ہوتا ہے اور انگرامینو یا اہرمن شر و فساد کا خالق ٹھہرتا ہے ۔ مجوسیوں کے مطابق یہی انگرامینو یا اہرمن ہی اصل میں ابلیس ہوتا ہے۔مجوسیوں کے ثنوی افکار اتنے اثر گزار ہوتے ہیں کہ ابراہیمی ادیان میں سے سب سے قدیم ترین مذہب یعنی یہودیت پر اس کے اثرات کافی نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ اثرات یہودیوں پر بابل کے زمانے کی اسارت کے دوران نامحسوس انداز میں پڑ گئے ۔ اگر چہ ان کے تصور ابلیس پر مختلف اقوام و مذاہب جیسے قبطی، آرامی، فلسطی وغیرہ کے اثرات بھی نظر آتے ہیں مگر مجوسیوں کے تصور ابلیس اور مجموعی طور پر تصور شر و بدی کے آثار بر جستہ طور پر ان کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔ چناں چہ تورات کے اولین صحائف میں ابلیس اور تصور شر کے متعلق ایک ثنوی رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے اور مجوسیوں کی طرح وہاں بدی کے عاملین تخلیقی قوت کے اعتبار سے مستقل بالذات

دکھائی دینے کے علاوہ ہستی میں جو ظاہراً شر وفساد موجود ہے اس کے خالق بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی بہ نسبت تورات کی اخیر دور کی کتابوں میں تصور بدی و تصور ابلیس تورات کی پہلی والی کتابوں سے کافی مختلف نظر آتا ہے۔ یہودی اس دور میں عزازیل کو شیطان ماننے لگتے ہیں جو ان کی نظر میں ایک متمرد فرشتہ ہونے کے علاوہ انسانوں کے لیے ذریعہ آزمائش محسوب ہوتا ہے۔ابلیس کے متعلق یہ اصلاح یافتہ نظریہ دراصل یہودیوں کے اخیر دور کے پیامبروں کی اصلاحی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی اصلاح شدہ اور تنقیح یافتہ عقیدہ و نقطۂ نظر عیسائیوں کے پاس پہنچ کر ایک ترقی یافتہ شکل اختیار کرتا ہے۔ منجملہ عیسائی تعلیمات میں ابلیس کو صرف ایک سرکش فرشتہ مانا جاتا ہے جس کی غایت وجود ان کے مطابق یہ ہے کہ اس کے توسط سے انسانوں کو آزمائش میں ڈالا جا تا ہے۔ چناں چہ انجیل میں ایسے بہت سے مواقع نظر آتے ہیں جہاں شیطان مسیح کو آزماتے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ عیسائیوں کا تصور ابلیس یہودیوں کے اصلاح شدہ تصور کا ایک ارتقا یافتہ تتمہ وتکملہ ہے۔

بدی و شرور اور تصور ابلیس کے متعلق جہاں تک ایک کامل ، واضح ، صاف و شفاف، عقلی ومنطقی اور کسی ذہنی وفکری التباس سے عاری ایک تصور کی بات ہے تو وہ صرف دین اسلام نے پیش کیا ہے۔اسلام ابلیس کی جنس ، ہیئت ترکیبی ، اس کی غایت و مقصد خلقت ، اس کے عروج وزوال اور اس کی وجہ شیطنت وغیرہ کو بغیر کسی منطقی جھول کے واضح کرتا ہے۔ ابلیس جنوں میں سے ہوتا ہے جنہیں خدا نے آگ سے پیدا کیا ہیں۔اس نے ناقابل تصور و ناقابل احصاء مدت تک خدا کی پرستش کی جس کی بدولت اس نے ایک عظیم قوت وعظمت حاصل کی ؛ اس قوت و عظمت کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ ملائکہ اس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں۔ اس کے زوال و انحطاط کی ابتدا تب ہوتی ہے جب وہ آدم کو سجدہ کرنے کے حکم خداوندی سے سرپیچی کرتا ہے۔آدم کے نیابت الٰہی کے عظیم منصب پر فائز ہونے ،جس کی سب سے بڑی علامت رسالت ہے، ابلیس انتہائی درجے کا حسد وبغض رکھنے لگا اور یہی بغض وعناد آخر پر اس کے سقوط کا باعث بنتا ہے۔

جہاں تک مجموعی طور پر فلسفۂ شرور کی بات ہے تو اسلام اسے ایک حکیمانہ انداز میں حل و فصل کرتا ہے۔اسلام کی رو سے ہستی میں جتنے بھی شرور انہ مظاہر یا ظاہر میں دکھنے والی طبیعی نا ہمواریاں اور بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں اعتباری و اضافی (Relative) نوعیت کی ہیں جن کا کوئی پائیدار وجودنہیں ہیں۔ یہ صرف کسی عارضی زمان و مکاں میں حق کے عدم وجود پہ دلالت کرتے ہیں یعنی ان کی موجودیت تب تک ہیں جب تک حق کسی علت کی وجہ سے غیر موجود ہوتا ہے۔ جونہی حق ظاہر ہوتا ہے تو باطل فنا ہوتا ہے۔ ابلیس اس ہستی میں شرور کا ایک بارز نمونہ ہے اور اس کے شرورانہ افعال و اعمال اعتباری و اضافی ہونے کی وجہ سے محکوم بہ فنا ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کے مطابق ابلیس کسی مستقل تخلیقی فعلیت کا حامل نہیں ہے بلکہ وہ ایک وقتی و عارضی تخلیقی سرگرمی سے سروکار رکھتا ہے جو بالآخر مشیت پروردگار ہی کی محتاج ہوتی ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا کہ ابلیس خدا کے حکم سے روگردانی کر کے اس کی بارگاہ اقدس سے محروم ہوتا ہے جو اس کے لئے جنت سے مترادف ہوتی ہے، جس میں وہ سکون وسکوت محض کی صفات وخصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ مزید برآں وہ آدم کو بہلا پھسلا کر اس مخصوص جنت سے نکلواتے ہیں جس میں وہ حوا کے ساتھ زیر سکونت تھے۔ آدم اس جنت میں کسی تگ و دو، کوشش وجستجو اور ذوق نمود سے عاری زندگی بسر کر رہے تھے مگر جب ابلیس اسے ایک خطا کی بنا پر اس پرسکون جگہ سے نکلواتے ہیں تو دونوں اس دنیا کی پر از کشاکش، جہد مسلسل اور جستجو و آرزوؤں والی فضاؤں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اس طرح دونوں خودی کی بیکراں دنیاؤں سے رو برو ہوتے ہیں۔

خودی احساس نفس اور تعیین ذات کی روح پہ مشتمل ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی عشق، سوز و گداز، فراق اور جستجو و آرزو ہیں۔ جہاں تک خودی کے اجزائے ترکیبی عشق، سوز و گداز، فراق اور جستجو و آرزو وغیرہ کا تعلق ہیں تو ابلیس کی رومانٹیک شخصیت میں یہ بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ انہیں اوصاف وخصوصیات کی بنا پر وہ اقبال کے فلسفہ خودی کے بر جستہ مظاہر میں سے ایک ٹھہرتا ہے ۔ اور یہ اوصاف وخصوصیتیں ابلیس کی شخصیت کے ایجابی خصائل ہیں جن

کی بدولت وہ اقبال کے علامتی و استعاراتی نظام میں ایک خاص جگہ کا مستحق قرار پایا ہے ۔ علاوہ بریں صبر و صلابت ، دقت و بصیرت اور حسن تدبیر ابلیس کی پیچیدہ شخصیت و کردار کے ایسے مثبت نکات ہیں جو اقبال کے منظور نظر ہیں۔ جہاں تک ابلیس کی شخصیت کے سلبی پہلو کی بات ہے تو اسے خودی کے سکے کے دوسرے رخ یعنی بے خودی میں دیکھا جا سکتا ہے ۔خودی کی تکمیل بے خودی میں ہوتی ہے اور بے خودی کے جو اساسی ارکان ہیں وہ توحید و رسالت ہیں۔ابلیس خود ذاتی طور پر موحد واقعی ہے مگر رسالت کا ازلی دشمن !۔ وہ نیابت الٰہی کے اس ملکہ و منصب عظیم سے اس لیے حسد و کد رکھتا ہے کیونکہ وہ خدا کی بارگاہ اقدس سے اسے اپنے محروم ہونے کی بنیادی وجہ مانتا ہے ۔ رسالت نیابت الٰہی کا ایک نمایاں ترین پرتو ہے جس سے آدم و بنی نوع آدم سرفراز ہوئے ہیں۔اقبال کے نقطۂ نظر سے رسالت اجتماعی سطح پر خودی اور آئین الٰہی کی مجسم تعبیر ہے، رسالت بنی نوع انسان کو خودی و بے خودی کی حیات سے ہمکنار کروا کے بالآخر ایک ایسی حیات سے روشناس کرواتی ہے جو مشیت و ارادے ،تخلیق و تولید مقاصد اور سوز و فراق کی جاودانیوں سے عبارت ہوتی ہیں۔ ابلیس آدم کو اس منصب اور منصب کے متذکرہ بالا اوصاف سے اپنے حسد وحقد کی بنا پر محروم کرنے کے لیے اس دنیا میں ایک عظیم پیکار و رستاخیز کی بنا رکھتا ہے۔ وہ آدم کو سرنگوں اور ذلیل و زبوں کرنے کے لیے بہت سے حربے و ہتھکنڈے آزماتا ہیں۔ بقول اقبال ابلیس اس ہدف کو پانے کے لیے خاک سے یعنی خود انسان سے ہی اپنے خاکی مظاہر معرض وجود میں لاتا ہیں:

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

اقبال کے فکر وفن میں ابلیس کے جو چیدہ اور انتہائی موثر مظاہر ایک خاص سیاق و سباق کے تحت اپنی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں وہ حسی عقلیت پرستی ، نژاد پرستی ، وطنیت مبنی بر عصبیت ، ملوکیت ، سرمایہ داری ،اشتراکیت ، سیکولرازم و سیکولر جمہوریتیں ، مادہ پرست مغربی تہذیب ، استعمار ، تقدیر پرستی، رہبانی تصوف اور کلامی مناقشات ہیں۔ یہ سبھی مظاہر اپنے معنوی

تانے بانے کے تحت اقبال کے نقطۂ نظر سے ابلیسیت کے ساتھ پوری طرح مربوط و ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ابلیس کے یہ متنوع موجود خاکی مظاہر اور متوقع دوسرے انگنت مظاہر اقبال کی نظر میں دراصل نوع انسان کے لیے ایک امتحان و آزمائش کا ساماں ہیں تاکہ یہ حقیقت واضح و عیاں ہو جائے کہ نوع آدم میں کون سے افراد یا کون سی ملتیں و امتیں اصلح اور کونسی نالائق و نارسا ہیں۔انسانوں کی اکثریت ابلیس کے حربوں کا طعمہ بنتی ہیں اور چھوٹی سی اقلیت اسے مات دیتی ہے۔ بقول مولانا روم:

امتحان شیر و کلبم کرد حق
امتحان نقد و قلبم کرد حق
نیکوان را رہنمائی می کنم
شاخھای خشک را بر می کنم

حق و باطل کی آویزش اور کشاکش کے پیش نظر ہی اقبال ابلیس کے وجود کو نوع انسان اور انسان کامل کے ارتقاء و عروج کے لیے ایک امر ضروری کی حیثیت سے دیکھتے ہیں:

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطان ندارد

خودی و بے خودی کی صفات سے کامل طور پر آراستہ ہوکر انسان کامل اور امت کاملہ ہی اس رستاخیز سے سرخرو ہو کے نکلتی ہیں اور ابلیس و ابلیسیت اپنے لاؤ لشکر کے سمیت آخر پر شکست و ریخت سے دو چار ہوتے ہیں۔مرد حق و امت حق کے ہاتھوں یہ شکست ابلیس کے لیے بڑی شیریں وخوش کام ہوتی ہے۔بقول اقبال:

اے خدا یک زندہ مرد حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست

کتابیات

۱۔ قرآن مجید،(مثل تاج کمپنی لاہور،)علیم بک ڈپو،دہلی،سنہ ندارد۔

۲۔ اصفہانی،امام راغب،مفردات القرآن،(ترجمہ حواشی مولانا محمد عبدہ فیروز پوری) شیخ شمس الحق ۲۳۸ کشمیر بلاک اقبال ٹاون ،لاہور،۱۹۸۷ء۔

۳۔ اقبال،علامہ،کلیات اقبال فارسی،شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور پاکستان،سنہ ندارد۔

۴۔ اقبال، علامہ،کلیات اقبال اردو (مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی)، کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۴ء۔

۵۔ اقبال، علامہ،فلسفہ عجم،(ترجمہ میر حسن الدین بی اے ایل ایل بی)،قاری پبلکیشنز ترکمان گیٹ دہلی،۲۰۰۶ء۔

۶۔ اقبال، علامہ،تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،(ترجمہ سید نذیر نیازی)،،عشرت علی ناصری برائے اسلامک بک سینٹر نئی دہلی،۱۹۹۲ء۔

۷۔ اقبال ،علامہ،خطبات اقبال(ترجمہ وحواشی محمد جہانگیر عالم)،فرید بک ڈپو،نئی دہلی،۲۰۰۵ء۔

۸۔ اقبال ، ڈاکٹر جاوید ،زندہ رود،علمی اکیڈیمی،نئ دہلی،۲۰۱۴ء۔

۹۔ اقبال،ڈاکٹر جاوید،افکار اقبال(تشریحات جاوید)،سنگ میل پبلکیشنز، لاہور،۲۰۱۵ء۔

۱۰۔ اقبال، ڈاکٹر جاوید،مے لالہ فام،اقبال اکادمی ، پاکستان،۲۰۰۳ء۔

۱۱۔ انور،ڈاکٹرعشرت حسن،اقبال کی مابعد الطبیعیات(ترجمہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی) گلشن پبلشرز گاو کدل چوک ،ایکس چینج روڑ ،سرینگر،۹۲-۱۹۹۱ء۔

۱۲۔ برنی،سید مظفر حسین ،کلیات مکاتیب اقبال،اردو اکادمی،۲۰۱۰ء۔

۱۳۔ برنا باس ،،انجیل برناباس (ترجمہ مولانا محمد حلیم انصاری)،فرید بک ڈپو،نئ دہلی،۲۰۰۴ء۔

۱۴۔ بقا،محمد شریف،اقبال اور تصوف،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ،دہلی،۲۰۰۴ء۔

۱۵۔ بقا،محمد شریف،خطبات اقبال ایک جائزہ،گلشن پبلشرز مدینہ چوک، سرینگر،۱۹۹۴ء۔

۱۶۔ حضرت علی، نہج البلاغہ (ترجمہ و شرح حجتہ الاسلام مفتی جعفر حسین)، عباس بک ایجنسی رستم نگر، لکھنو، ۲۰۰۴ء۔
۱۷۔ رضوی، سید مراد رضا، جن ایک قرآنی، روائی اور عقلی تحقیق و تحلیل، انتشارات مرکز جہانی علوم اسلامی، قم ایران، ۲۰۰۷ء۔
۱۸۔ شفائی، شکیل، اکیسویں صدی میں فکر اقبال کی معنویت، وین گارڈ پبلکیشنز، سرینگر، کشمیر، ۲۰۰۶ء۔
۱۹۔ شیرازی، آیت اللہ ناصر مکارم، تفسیر نمونہ (ترجمہ سید صفدر حسین نجفی)، عباس بک ایجنسی رستم نگر لکھنو، ۲۰۰۷ء۔
۲۰۔ صدیقی، محمد مظہر الدین، اسلام اور مذاہب عالم، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء۔
۲۱۔ طارق، ایس عبداللہ، اگر اب بھی نہ جاگے تو، روشنی پبلشنگ ہاوس بازار نصر اللہ خان، رام پور، ۱۹۸۹ء۔
۲۲۔ عبد الحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکر اقبال، دار الاشاعت مصطفائی، دہلی، ۲۰۱۴ء۔
۲۳۔ غزالی، حجت الاسلام، احیاء العلوم الدین، (ترجمہ مولانا محمد صدیق ہزاروی)، فاروقہ بک ڈپو، دہلی، سنہ ندارد۔
۲۴۔ فتحپوری، ڈاکٹر فرمان، اقبال سب کے لیے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۱۴ء۔
۲۵۔ فقیر، سید وحید الدین، روزگار فقیر، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء۔
۲۶۔ کتاب مقدس (اردو)، انٹرنیشنل بائبل سوسائٹی، یو ایس اے، ۲۰۰۵ء۔
۲۷۔ کیلانی، مولانا عبدالرحمٰن، مترادفات القرآن مع فروق اللغویہ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء۔
۲۸۔ لاری، علامہ مجتبیٰ موسوی، مغربی تمدن کی ایک جھلک، (ترجمہ مولانا روشن علی)، سازمان تبلیغات اسلامی روابط بین المللی، ایران، ۱۴۰۳ھ۔
۲۹۔ مالک رام، جموربی اور بابلی تہذیب و تمدن، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء۔
۳۰۔ محمد قطب، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، (ترجمہ محمد سلیم کیانی ایم اے) مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء۔

۳۱۔ محمد قطب،اسلام اور جدید مادی افکار(ترجمہ سجاد احمد کاندھلوی)، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز ،نئی دہلی،۱۹۹۰ء۔
۳۲۔ مطہری ، استاد شہید مرتضٰی،خدمات متقابل اسلام و ایران،انتشارات صدرا ،قم ایران،۱۴۳۸ھ۔
۳۳۔ مطہری ، استاد شہید مرتضٰی،فطرت ، انتشارات صدرا ،قم ایران، ۱۴۳۷ء۔
۳۴۔ مطہری ، استاد شہید مرتضٰی، عدل الٰہی،انتشارات صدرا ،قم ایران،۱۴۳۸ھ۔
۳۵۔ مطہری ، استاد شہید مرتضٰی،اسلامی اقتصاد کا ایک جائزہ،(ترجمہ سید مسعود اختر رضوی)، سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی ادارہ ترجمہ واشاعت، ایران،۱۴۱۷ھ۔
۳۶۔ مطہری، استاد شہید مرتضٰی، اسلامی علوم کا تعارف،(ترجمہ سید محمد عسکری)، سازمان فرہنگ و ارتباطات اسلامی ،ایران،۱۴۱۷ھ۔
۳۷۔ ملا مسیح پانی پتی،رامایانا(تصحیح توضیح وتعلیقات دکتر سید عبد الحمید ضیائی،پروفسور محمد یونس جعفری)،مرکز تحقیقات فارسی رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران،دہلی نو،۲۰۰۹ء۔
۳۸۔ مولانا ،محمد جلال الدین بلخی (مولانا رومی)،مثنوی معنوی،(تصحیح ،مقدمہ وکشف الابیات از قوا م الدین خرم شاہی)،انتشارات دوستان خیابان انقلاب،خیابان فخر رازی،تہران ایران،۱۳۹۲ھ ش۔
۳۹۔ مودودی،سید ابوالاعلیٰ،اسلام اور جدید معاشی نظریات،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،نئی دہلی،۲۰۰۴ء۔
۴۰۔ مودودی،سید ابوالاعلیٰ، پردہ ،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشر، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء۔
۴۱۔ مودودی،سید ابوالاعلیٰ،تجدید واحیاے دین،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشر ،نئی دہلی،۲۰۰۸ء۔
۴۲۔ ندوی، مولانا سید ابوالحسن،نقوش اقبال،(ترجمہ مولوی شمش تبریز خاں)،مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ،لکھنو، ۲۰۰۲ء۔
۴۳۔ نعمانی،علامہ شبلی،علم الکلام،دارالمصنفین شبلی اکیڈیمی اعظم گڈھ،۱۹۹۳ء۔
۴۴۔ نیازی ،سید نذیر،حیات اقبال(دانائے راز)،اشرف بک ڈپو ریڈ کراس روڑ سرینگر،کشمیر،۲۰۱۴ء۔

۴۵۔ نیازی، مولانا ظفر، ابلیس کی داستان حیات المعروف شیطان کی سوانح عمری، آستانہ بک ڈپو، سوئیوالا ن نئی دہلی، سنہ ندارد۔

۴۶۔ ہاشمی، شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصور دین، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء۔

انگریزی کتابیں

1 Blackburn,simon,Oxford Dictionary of Philosophy,Oxford University press, New York, 2008.

2 Britannica ready refrence Encyclopedia,Encyclopedia Britannica(India)pvt,ltd,new delhi and impulse marketing new delhi,2005.

3 Carus,paul,The History of the Devil and the idea of evil from the earliest times to the present day,sacred texts.com,may-sept 2002.

4 Encyclopedia britannica,Encyclopedia britannica inc(William Benton publisher),1972.

5 Loomba Ania, Colonialism/Post colonialism, Routledge Taylor and Francis Group, London and New York, 2013.

6 Milton John, Paradise Lost, edited By Vrinder Nabar, Orient Blackswan Pvt Ltd, Hyderabad India, 2011.

7 Mohsin Abrar, Mohsin Kamran, Life in Ancient civilization, Book palace Gola cottage, Darya Ganj, New Delhi, 2003.

8 Said, Edward W, Culture and imperialism, Vintage books London UK, 1994.

رسالے

نقوش، رسول نمبر، ادارہ کتاب الشفاء، کوچہ چیلان دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء۔

علامہ اقبال کے تصور ابلیس کی معنوی جہات

مقالہ برائے

ایم۔فل

مقالہ نگار

ہادی احمد بیگ

نگران

ڈاکٹر راشد عزیز

شعبۂ اُردو

سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر

۲۰۱۸

ماحصل

تصور ابلیس اپنے سیر تکامل میں مختلف انسانی تمدنوں ، تہذیبوں اور ادیان میں گو نا گوں اشکال اور متنوع پیرائیوں میں موجود رہا ہے۔ کہیں پر یہ تصور ان تہذیبوں ، تمدنوں و ادیان کے حوالے سے غیر عقلی و غیر منطقی دکھائی دے رہا ہے تو کسی جگہ عقلی و منطقی خصائص کا حامل ۔ تاریخ بابل یا قدیم عراق کو انسانی تمدن کا پہلا گہوارہ تسلیم کرتی ہے جہاں اولین بار مختلف اجتماعی و سیاسی تصورات کی شکل گیری ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی و اعتقادی نظریات کی جو بابل کے نظام معاشرت میں مرکزی حیثیت کے حامل تھے کی داغ بیل بھی پڑ گئیں۔ ان مذہبی و اعتقادی تصورات ونظریات میں ان کا تصور ابلیس نمایاں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وہ امتداد زمانہ کے ساتھ اپنی طاقتور دیوی تیامت کو بحیثیت شیطان اس وقت ماننے لگے جب وہ بابل کے دوسرے بڑے دیوتاؤں جیسے مردوخ وغیرہ کی دشمنی پہ اتر آئی اور اس کے علاوہ ساری کائنات کو نیست و نابود کرنے پے تل گئی۔ بابلیوں کی طرح قدیم مصری بھی اپنی مذہبی و اعتقادی تاریخ کے ایک مرحلے پر اپنے ایک خاص دیوتا سیت یا سیتھ کو اس وقت شیطان کے بطور اپنے اعتقادی نظام میں جگہ دینے لگے جب اس کے ہاتھوں ان کے زرخیزی کے دیوتا اوزیرس کا قتل ہوتا ہے۔ یونانی و رومی تہذیب وتمدن اپنی اوائل عمری سے ہی مادی شعور اور مادہ پرستانہ فکری و عملی منہاج کے پیش نظر شہرہ آفاق رہے ہیں۔ مادہ پرستانہ زندگی کی وسوسہ انگیز اور مخمصہ خیز سرگردانیاں ان کے تصور شر و بدی اور تصور ابلیس میں بھی سرایت کیے ہوئے نظر آتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے دیوتاؤں جیسے زیوس، اپالون وغیرہ کو عیاری و مکاری ، عیاشی و بدمعاشی اور ہر طرح کی کثافت کاری کے نمائندہ مظاہر جان کر انہی کو دیوتا ہونے کے ساتھ ساتھ شیطانی عوامل بھی گردانتے تھے کیونکہ یہ دیوتا منصۂ شہود پر کبھی اپنے مثالی رخ تو کبھی ابلیسی لباس میں ظاہر ہوتے تھے۔

مذاہب و ادیان میں تصور ابلیس کے حوالے سے دنیا کا ایک قدیم دیومالائی مذہب (Mythological Religion) ہندومت اپنی تاریخی قدامت کے لحاظ سے قابل توجہ ہے ۔ اس دیومالائی مذہب میں دیوی دیوتاؤں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہیں، جن میں نمایاں ترین

ویشنو اور شیوا وغیرہ ہیں جو برہما کے اوتار مانے جاتے ہیں۔ یونانی و رومی دیوتاؤں کی طرح ہند ومت کے دیوتا اور دیویاں بھی کبھی کبھار اپنے نیکی کے رخ کو چھوڑ کر شیطنت آمیز صورت اختیار کرتے ہیں، جس کو مد نظر رکھ کر یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اس دیومالائی مذہب میں بھی ابلیس کا کوئی مشخص تصور نہیں ملتا ہے۔ اس صورت حال کے باوجود راون اور اندھک آسر کے روپ میں اس مذہب میں ابلیسیت کے دو نمونے ملتے ہیں۔ اگر چہ وہ بھی اپنی اولین صورت میں دیوتا ہی ہیں۔ایرانی آریاؤں کی ثقافتی عظمت اور تاریخی قدامت کے ساتھ ساتھ ان کی اعتقادی انفرادیت بھی پوری دنیا پہ واضح ہے کیونکہ انہوں نے اپنی طویل مذہبی تاریخ کے کسی بھی مرحلے پر باضابطہ طور پر بت پرستی اختیار نہیں کی جو وحیانی مذاہب کے نقطۂ نظر سے ان کا ایک انفرادی وصف مانا جاتا ہے، مگر ہستی مطلق کے متعلق ان کا ثنوی (Dualistic) نقطۂ نظر ان کی اعتقادی حیرانی و سرگردانی کی بخوبی آئینہ داری کرتا ہے۔ اول اول زرتشتی مذہب ثنوی آلائشوں سے پاک و صاف ہوتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ زرتشتی تعلیمات مجوسی علماؤں کے ہاتھوں مسخ ہو کر ایک ثنوی شکل میں بر آمد ہوتی ہے۔ جن کی رو سے اس کائنات کے دو خالق قرار پاتے ہیں؛ آہورا مزدا یا یزدان نیکی اور خیر و صفا کا خالق متصور ہوتا ہے اور انگرامینو یا اہرمن شر و فساد کا خالق ٹھہرتا ہے ۔ مجوسیوں کے مطابق یہی انگرامینو یا اہرمن ہی اصل میں ابلیس ہوتا ہے۔مجوسیوں کے ثنوی افکار اتنے اثر گزار ہوتے ہیں کہ ابراہیمی ادیان میں سے سب سے قدیم ترین مذہب یعنی یہودیت پر اس کے اثرات کافی نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ اثرات یہودیوں پر بابل کے زمانے کی اسارت کے دوران نامحسوس انداز میں پڑ گئے ۔ اگر چہ ان کے تصور ابلیس پر مختلف اقوام و مذاہب جیسے قبطی، آرامی، فلسطی وغیرہ کے اثرات بھی نظر آتے ہیں مگر مجوسیوں کے تصور ابلیس اور مجموعی طور پر تصور شر و بدی کے آثار بر جستہ طور پر ان کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔ چناں چہ تورات کے اولین صحائف میں ابلیس اور تصور شر کے متعلق ایک ثنوی رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے اور مجوسیوں کی طرح وہاں بدی کے عاملین تخلیقی قوت کے اعتبار سے مستقل بالذات

دکھائی دینے کے علاوہ ہستی میں جو ظاہراً شر وفساد موجود ہے اس کے خالق بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی بہ نسبت تورات کی اخیر دور کی کتابوں میں تصور بدی و تصور ابلیس تورات کی پہلی والی کتابوں سے کافی مختلف نظر آتا ہے۔ یہودی اس دور میں عزازیل کو شیطان ماننے لگتے ہیں جو ان کی نظر میں ایک متمرد فرشتہ ہونے کے علاوہ انسانوں کے لیے ذریعہ آزمائش محسوب ہوتا ہے۔ ابلیس کے متعلق یہ اصلاح یافتہ نظریہ دراصل یہودیوں کے اخیر دور کے پیامبروں کی اصلاحی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی اصلاح شدہ اور تنقیح یافتہ عقیدہ و نقطۂ نظر عیسائیوں کے پاس پہنچ کر ایک ترقی یافتہ شکل اختیار کرتا ہے۔ منجملہ عیسائی تعلیمات میں ابلیس کو صرف ایک سرکش فرشتہ مانا جاتا ہے جس کی غایت وجود ان کے مطابق یہ ہے کہ اس کے توسط سے انسانوں کو آزمائش میں ڈالا جا تا ہے۔ چناں چہ انجیل میں ایسے بہت سے مواقع نظر آتے ہیں جہاں شیطان مسیح کو آزماتے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ عیسائیوں کا تصور ابلیس یہودیوں کے اصلاح شدہ تصور کا ایک ارتقا یافتہ تتمہ وتکملہ ہے۔

بدی و شرور اور تصور ابلیس کے متعلق جہاں تک ایک کامل، واضح، صاف و شفاف، عقلی ومنطقی اور کسی ذہنی وفکری التباس سے عاری ایک تصور کی بات ہے تو وہ صرف دین اسلام نے پیش کیا ہے۔ اسلام ابلیس کی جنس، ہیئت ترکیبی، اس کی غایت و مقصد خلقت، اس کے عروج وزوال اور اس کی وجہ شیطنت وغیرہ کو بغیر کسی منطقی جھول کے واضح کرتا ہے۔ ابلیس جنوں میں سے ہوتا ہے جنہیں خدا نے آگ سے پیدا کیا ہیں۔ اس نے نا قابل تصور و نا قابل احصاء مدت تک خدا کی پرستش کی جس کی بدولت اس نے ایک عظیم قوت وعظمت حاصل کی ؛ اس قوت و عظمت کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ ملائکہ اس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں۔ اس کے زوال و انحطاط کی ابتدا تب ہوتی ہے جب وہ آدم کو سجدہ کرنے کے حکم خداوندی سے سرپیچی کرتا ہے۔ آدم کے نیابت الٰہی کے عظیم منصب پر فائز ہونے، جس کی سب سے بڑی علامت رسالت ہے، ابلیس انتہائی درجے کا حسد وبغض رکھنے لگا اور یہی بغض وعناد آخر پر اس کے سقوط کا باعث بنتا ہے۔

جہاں تک مجموعی طور پر فلسفۂ شرور کی بات ہے تو اسلام اسے ایک حکیمانہ انداز میں حل و فصل کرتا ہے۔اسلام کی رو سے ہستی میں جتنے بھی شرورانہ مظاہر یا ظاہر میں دکھنے والی طبیعی نا ہمواریاں اور بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں اعتباری و اضافی (Relative) نوعیت کی ہیں جن کا کوئی پائیدار وجودنہیں ہیں۔ یہ صرف کسی عارضی زمان و مکاں میں حق کے عدم وجود پہ دلالت کرتے ہیں یعنی ان کی موجودیت تب تک ہیں جب تک حق کسی علت کی وجہ سے غیر موجود ہوتا ہے۔ جونہی حق ظاہر ہوتا ہے تو باطل فنا ہوتا ہے۔ ابلیس اس ہستی میں شرور کا ایک بارز نمونہ ہے اور اس کے شرورانہ افعال و اعمال اعتباری و اضافی ہونے کی وجہ سے محکوم بہ فنا ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کے مطابق ابلیس کسی مستقل تخلیقی فعلیت کا حامل نہیں ہے بلکہ وہ ایک وقتی و عارضی تخلیقی سرگرمی سے سروکار رکھتا ہے جو بالآخر مشیت پروردگار ہی کی محتاج ہوتی ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا کہ ابلیس خدا کے حکم سے روگردانی کر کے اس کی بارگاہ اقدس سے محروم ہوتا ہے جو اس کے لئے جنت سے مترادف ہوتی ہے، جس میں وہ سکون وسکوت محض کی صفات وخصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ مزید برآں وہ آدم کو بہلا پھسلا کر اس مخصوص جنت سے نکلواتے ہیں جس میں وہ حوا کے ساتھ زیرسکونت تھے۔ آدم اس جنت میں کسی تگ و دو ، کوشش وجستجو اور ذوق نمود سے عاری زندگی بسر کر رہے تھے مگر جب ابلیس اسے ایک خطا کی بنا پر اس پرسکون جگہ سے نکلواتے ہیں تو دونوں اس دنیا کی پر از کشاکش ، جہد مسلسل اور جستجو و آرزوؤں والی فضاؤں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اس طرح دونوں خودی کی بیکراں دنیاؤں سے رو برو ہوتے ہیں۔

خودی احساس نفس اور تعیین ذات کی روح پہ مشتمل ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی عشق، سوز و گداز ، فراق اور جستجو و آرزو ہیں۔ جہاں تک خودی کے اجزائے ترکیبی عشق ، سوز و گداز ، فراق اور جستجو و آرزو وغیرہ کا تعلق ہیں تو ابلیس کی رومانٹیک شخصیت میں یہ بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ انہیں اوصاف وخصوصیات کی بنا پر وہ اقبال کے فلسفہ خودی کے بر جستہ مظاہر میں سے ایک ٹھہرتا ہے ۔ اور یہ اوصاف وخصوصیتیں ابلیس کی شخصیت کے ایجابی خصائل ہیں جن

کی بدولت وہ اقبال کے علامتی و استعاراتی نظام میں ایک خاص جگہ کا مستحق قرار پایا ہے ۔ علاوہ بریں صبر و صلابت ، دقت و بصیرت اورحسن تدبیر ابلیس کی پیچیدہ شخصیت و کردار کے ایسے مثبت نکات ہیں جو اقبال کے منظور نظر ہیں۔ جہاں تک ابلیس کی شخصیت کے سلبی پہلو کی بات ہے تو اسے خودی کے سکے کے دوسرے رخ یعنی بے خودی میں دیکھا جا سکتا ہے ۔خودی کی تکمیل بے خودی میں ہوتی ہے اور بے خودی کے جو اساسی ارکان ہیں وہ توحید و رسالت ہیں۔ابلیس خود ذاتی طور پر موحد واقعی ہے مگر رسالت کا ازلی دشمن !۔ وہ نیابت الٰہی کے اس ملکہ و منصب عظیم سے اس لیے حسد و کد رکھتا ہے کیونکہ وہ خدا کی بارگاہ اقدس سے اسے اپنے محروم ہونے کی بنیادی وجہ مانتا ہے ۔ رسالت نیابت الٰہی کا ایک نمایاں ترین پرتو ہے جس سے آدم و بنی نوع آدم سرفراز ہوئے ہیں۔اقبال کے نقطۂ نظر سے رسالت اجتماعی سطح پر خودی اور آئین الٰہی کی مجسم تعبیر ہے، رسالت بنی نوع انسان کو خودی و بے خودی کی حیات سے ہمکنار کروا کے بالآخر ایک ایسی حیات سے روشناس کرواتی ہے جو مشیت و ارادے ،تخلیق و تولید مقاصد اور سوز و فراق کی جاودانیوں سے عبارت ہوتی ہیں۔ ابلیس آدم کو اس منصب اور منصب کے متذکرہ بالا اوصاف سے اپنے حسد وحقد کی بنا پر محروم کرنے کے لیے اس دنیا میں ایک عظیم پیکار و رستاخیز کی بنا رکھتا ہے۔ وہ آدم کو سرنگوں اور ذلیل و زبوں کرنے کے لیے بہت سے حربے و ہتھکنڈے آزماتا ہیں۔ بقول اقبال ابلیس اس ہدف کو پانے کے لیے خاک سے یعنی خود انسان سے ہی اپنے خاکی مظاہر معرض وجود میں لاتا ہیں:

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

اقبال کے فکر وفن میں ابلیس کے جو چیدہ اور انتہائی موثر مظاہر ایک خاص سیاق و سباق کے تحت اپنی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں وہ حسی عقلیت پرستی ، نژاد پرستی ، وطنیت مبنی بر عصبیت ، ملوکیت ، سرمایہ داری ،اشتراکیت ، سیکولرازم و سیکولر جمہوریتیں ، مادہ پرست مغربی تہذیب ، استعمار ، تقدیر پرستی، رہبانی تصوف اور کلامی مناقشات ہیں۔ یہ سبھی مظاہر اپنے معنوی

تانے بانے کے تحت اقبال کے نقطۂ نظر سے ابلیسیت کے ساتھ پوری طرح مربوط و ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ابلیس کے یہ متنوع موجود خاکی مظاہر اور متوقع دوسرے انگنت مظاہر اقبال کی نظر میں دراصل نوع انسان کے لیے ایک امتحان و آزمائش کا ساماں ہیں تا کہ یہ حقیقت واضح و عیاں ہو جائے کہ نوع آدم میں کون سے افراد یا کون سی ملتیں و امتیں اصلح اور کونسی نالائق و نارسا ہیں۔انسانوں کی اکثریت ابلیس کے حربوں کا طعمہ بنتی ہیں اور چھوٹی سی اقلیت اسے مات دیتی ہے۔ بقول مولانا روم:

امتحان شیر و کلبم کرد حق
امتحان نقد و قلبم کرد حق
نیکوان را رہنمائی می کنم
شاخھای خشک را بر می کنم

حق و باطل کی آویزش اور کشاکش کے پیش نظر ہی اقبال ابلیس کے وجود کو نوع انسان اور انسان کامل کے ارتقاء وعروج کے لیے ایک امر ضروری کی حیثیت سے دیکھتے ہیں:

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطان ندارد

خودی و بےخودی کی صفات سے کامل طور پر آراستہ ہوکر انسان کامل اور امت کاملہ ہی اس رستاخیز سے سرخرو ہو کے نکلتی ہیں اور ابلیس و ابلیسیت اپنے لاؤلشکر کے سمیت آخر پر شکست و ریخت سے دو چار ہوتے ہیں۔مرد حق و امت حق کے ہاتھوں یہ شکست ابلیس کے لیے بڑی شیریں وخوش کام ہوتی ہے۔بقول اقبال:

اے خدا یک زندہ مرد حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست